تحریک پاکستان میں

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا کردار

ڈاکٹر انوار احمد



بیکن بکس
گلگشت ملتان

تحریک پاکستان میں
علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا کردار

ڈاکٹر انوار احمد



بیکن بکس
گلگشت ملتان

بار اول ۱۹۹۳ء

قیمت 75 روپے

اپنے اساتذہ

پروفیسر خالد شبیر

(گورنمنٹ کالج فیصل آباد)

پروفیسر محمد افضل

(گورنمنٹ کالج سول لائنز ملتان)

سید افتخار حسین شاہ

(سابق صدر شعبہ ،گورنمنٹ کالج، بوسن روڈ، ملتان)

کے نام

فہرست ابواب و مشمولات

حرف سپاس

اقبالیات سے متعلق بہت سی کتب کے مطالعے سے پہلے میرا خیال تھا کہ افکار اقبال کی توضیح و تشریح کا حق علماء اور متخصصین کو ہے۔ مگر میں ممنون ہوں ان مصنفین کا، جن کی تصانیف نے مجھے حوصلہ دیا کہ شہد کی مکھی بن کر رنگ سے رس پیدا کیا جاسکتا ہے۔

میں اپنے استاد محترم خلیل صدیقی اور اپنے شہر کے دو عالموں ڈاکٹر مہر عبدالحق اور مرزا ابن حنیف کے متواتر تصنیفی عمل کے روبرو کئی برس منفعل رہنے کے بعد مکالمے اور لیکچر کو تحریری صورت میں محفوظ کرنے کی جانب مائل ہوا ہوں، گویا یہ فیض کشی (Inspiration) انہی کی دین ہے۔

میں اپنے شاگرد سید علمدار حسین بخاری کا بھی ممنون ہوں، جنہوں نے کتاب کی ترتیب و تدوین، پروف ریڈنگ اور طباعت کے تمام مراحل کی نگرانی کے تمام امور اپنے ذمے لیے۔ میں ان کے سہرے کے پھولوں کا ممنون ہوں کہ جن کے طفیل ان میں نوجوانی عود کر آئی ہے۔

میں اپنے دوست اصغر ندیم سید کا بھی ممنون ہوں کہ اس نے بلبل بے تاب کی طرح گفتگو کرتے رہنے کی بجائے اپنے تخلیقی ذہن اور دل ناصبور کی تحویل میں نہ رکنے والا قلم اور نا مختتم کاغذ دے کر پاکستان کے صف اول کے ڈرامہ نگار کا اعزاز پایا ہے۔

میں اپنے بزرگ عرش صدیقی کا بھی ممنون ہوں، جنہوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد تحقیق و تنقید پر بھرپور توجہ دی اور کسی بھی موضوع کے لئے نوجوان ریسرچ سکالرز کی طرح مواد جمع کیا، عالموں کی طرح تجزیہ کیا، ڈاکٹر فرمان فتح پوری جیسے مثالی اساتذہ کی طرح لکھا۔

میں اپنے رفیق کار محمد ساجد خان اور اپنے ہونہار شاگردوں قاضی عبدالرحمن اور راشدہ قاضی کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں، جنہوں نے مطلوبہ کتب کی فراہمی میں میری مدد کی، اگر میں نے زندگی میں نامور مصنف بننے کا فیصلہ کیا تو ممکن ہے کہ لکھنے کا کام انہی کے سپرد کر کے تدوین اپنے ذمے لے لوں۔

میں بیکن بکس ملتان کے دوستوں عبدالجبار اور محمد فیض کا بھی ممنون ہوں، جو اپنی گرمجوش اعانت کے وعدے سے میرے انجماد کو پگھلاتے رہتے ہیں۔

انوار احمد

باب اول

پس منظر

الف) ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور اثرات

ب) انگریزوں کی آمد اور اثرات

ج) ہندو مسلم اختلافات اور برطانوی پالیسی

د) سرسید احمد خان کی سیاسی خدمات

ھ) انڈین نیشنل کانگریس کا قیام ۱۸۸۵ء

و) بیسویں صدی کے اوائل کا برصغیر

ز) تقسیم بنگال۔ اکتوبر ۱۹۰۵ء

ح) شملہ وفد

ط) مسلم لیگ کا قیام دسمبر ۱۹۰۶ء

ی) منٹو مارلے اصلاحات ۱۹۰۹ء

ک) ہندوؤں، مسلمانوں اور انگریزوں کے باہمی تعلقات میں تبدیلی

ل) جلیانوالہ باغ کا سانحہ اپریل ۱۹۱۹ء

م) تحریک خلافت

ن) ۱۹۳۰ء تک کی سیاسی اور سماجی صورت حال

باب اول

الف) ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور اثرات

یہ بھی وقت کی ستم ظریفی ہی ہے کہ بیسویں صدی میں جو زمین مسلمانوں پر تنگ ہوئی' اس کا نام "ہند" بھی مسلمانوں نے ہی رکھا(۱)۔ وسط ایشیا سے اٹھ کر ہند میں داخل ہونے والے آریاؤں نے اس زمین کے فرزندوں (دراوڑ' کول' بھیل) کو بظاہر آسمانی سند کے ساتھ شودر اور اچھوت بنا دیا تھا' مگر مسلمان اس سرزمین پر مساوات انسانی کی بشارت لے کر پہنچے' جہاں آبادی کا بیشتر حصہ شرف آدمیت سے محروم تھا' جہاں روحانیت کے چرچے تو تھے' مگر بہت سے لوگوں کو مذہبی اشلوک تک سننے کی اجازت نہ تھی' جہاں بیوگی ایک لعنت تھی' مگر یہ عذاب بھی امتیازی تھا' اونچی ذات کی بیواؤں کو شوہر کی لاش کے ساتھ ہی جلا دیا جاتا مگر نچلے طبقے کی بیواؤں کی زندگی ہی مستقل چتا تھی۔۔۔۔۔۔ تاہم چھوت چھات اور مذہبی تنگ نظری کے باوجود اس سرزمین کے سلونے پن میں بڑی کشش اور یہاں کے رہنے والوں میں دل موہ لینے کا ہنر تھا۔ یہاں کی تہذیب کی توانائی' فلسفہ' نجوم' سنگ تراشی' موسیقی' رقص' مصوری' ناٹک اور شعروادب میں بھرپور طریقے سے جلوہ گر تھی۔

سندھ اور ملتان پر محمد بن قاسم کے حملے (۷۱۲ء) سے بھی پہلے مسلمان تاجر جنوبی ہند کے سواحل (مالا بار اور کارومنڈل) پر آباد تھے(۲)۔ دوسرے یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلم حکمرانوں کی بجائے مسلم صوفیاء نے اشاعت اسلام کا فریضہ انجام دیا۔ انہوں نے مقامی معاشرت سے مغائرت برتی نہ زبان سے کہ ان کا مکالمہ محبت سے رچا ہوا اور محبت کی خاطر تھا' اس لئے انہیں بے پناہ قبولیت نصیب ہوئی۔ سید محمد تقی نے انہیں بجا طور پر عوام دوست دانشور کا لقب دیا ہے۔(۳)

مسلمان فاتحین عرب' ترکستان' ایران اور افغانستان سے ہندوستان پہنچے' اس لئے ان کے بنیادی معتقدات میں تو اتنا اختلاف نہ تھا' جتنا زبان' ذوق' رسومات' عادات اور ثقافتی رویوں میں ترجیحات کا تھا۔ تاہم عجمی تہذیب کا رنگ غالب رہا اور فارسی زبان' درباری زبان رہی اور اس زبان کے شعروادب اور حکمت کا سرمایہ ایک طویل عرصے تک مقامی علمی و ادبی سرگرمیوں کا فکری اور جذباتی ماخذ رہا اور ہند مسلم کلچر کی تعمیر و تشکیل

میں اس کا کردار نمایاں رہا۔ ہندوؤں نے حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرنے مگر اپنی بنیادی عصبیتوں کی حفاظت کرنے کی صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ بلاشبہ انہوں نے مسلم کلچر سے اثرات قبول کئے اور رزم و بزم کی جلوہ نمائی میں کردار ادا کیا' مگر مناسب موقع کی تلاش میں رہتے ہوئے اپنی ہندوانہ شخصیت کی بقاء کا اہتمام بھی کیا۔ ادھر اس زمین پر موجود مسلمانوں کی غالب اکثریت ان افراد پر مشتمل تھی' جو شرف آدمیت کی بحالی کی نوید سن کر' آبائی عقائد ترک کر کے مسلمان ہوئے تھے۔ اس لئے ان کے اجتماعی لاشعور میں بھی ارضی مہک نے برصغیر کے مسلم کلچر کی تشکیل و تعمیر میں اہم کردار ادا کیا' جسے نظرانداز کرنا مناسب نہ ہو گا۔

ب) انگریزوں کی آمد اور اثرات

انگریز ہندوستان کو سونے کی چڑیا سمجھ کے آئے یا پھر ان مصالحوں کی تلاش میں' جو ان کے ہم وطنوں کی روکھی پھیکی غذا کو لذیذ بنا سکتے تھے' کیونکہ "الزبتھ دور میں وہاں کے باشندے موسم خزاں سے موسم بہار تک محض نمک ملا گوشت کھانے یا اپنے ماہی گیروں کے مفادات کی خاطر "رغبت" سے کچھ بڑھ کر مچھلی کھانے پر مجبور تھے۔"(۴) اس طرح ہمیں وی' آئی لینن کے ان الفاظ سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ معاملہ بہرطور معدے کا تھا۔(۵) یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے اس سرزمین پر قدم جماتے ہی لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے حصہ داروں نے بے حساب دولت کمائی' چنانچہ ڈاکٹر سیموئل جانسن نے لارڈ کلائیو کی خودکشی (۱۷۷۸ء) کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :

"اس شخص نے اپنی دولت ایسے گناہوں کے ارتکاب سے حاصل کی' جن کے احساس نے اسے خود اپنا گلا کاٹ لینے پر مجبور کر دیا۔"(۶)

بیسویں صدی میں جب برصغیر میں شدھی اور سنگٹھن کی تحریکیں چلائی گئیں تو بعض ہندو عناصر نے مسلمانوں اور انگریزوں' دونوں کو سامراجی اور غیر ملکی حملہ آور قوت قرار دیا' مگر غیر جذباتی انداز میں اس الزام کا جائزہ لیا جائے تو ایک امتیاز نمایاں ہوتا ہے کہ بیشتر مسلمان حملہ آوروں نے ہندوستان کو اپنا گھر بنا لیا' اور یوں اس سرزمین سے وابستہ ہو کر اس کی تزئین اور یہاں کے باشندوں کی دلجوئی اور تربیت کا اہتمام کیا' جس کا

اعتراف ڈاکٹر تارا چند نے اپنی کتاب Influence of Islam on Indian Culture میں جگہ جگہ کیا ہے۔ مگر انگریزوں نے ہندوستان کو اپنی نو آبادی ہی سمجھا اور ایک طرف یہاں کی دولت سمندر پار اپنے گھر بھجوانے کا فریضہ انجام دیا' دوسری طرف یہاں کی مقامی دستکاری اور صنعت کو تباہ کر کے ہندوستان کو محض اپنی مصنوعات کے لئے' خام مواد فراہم کرنے والے گودام اور پھر تیار شدہ مال کی منڈی میں تبدیل کر دیا۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ ممکن ہے کہ ابتداء میں مسلمان حکمران مقامی باشندوں کے مقابلے میں خود کو برتر سمجھتے رہے ہوں اور احساس برتری بلاشبہ فاتحین کا حق ہے' مگر اس کے پیچھے نسلی برتری کا غیر انسانی جذبہ کارفرما نہیں رہا ہو گا۔ (اسلامی تعلیمات کی بدولت) جو برطانوی سامراج کا بنیادی احساس تھا' کولن کراس نے لکھا ہے: "اس وقت بیشتر انگریزوں میں یہ یقین راسخ ہو چکا تھا کہ وہ دنیا کی بہترین قومیت ہیں۔"(۷) برطانوی ہند کے ایک افسر سر جون شور نے ۱۸۳۷ء میں لکھا: "بہت سے مواقع پر میں نے اپنے نوجوان افسروں سے اس طرح کے جملے سنے' مجھے دیسیوں سے سخت نفرت ہے' یا میں کالے شخص کی پٹائی کرنا چاہتا ہوں۔"(۸)

تاہم یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ برصغیر کے مسلم حکمرانوں کے مقابلے میں انگریز علم و ہنر کے بہتر یا موثر مادی اور فنی وسائل سے مسلح ہو کر ہندوستان میں داخل ہوئے۔ وہ یورپ کے سائنسی و صنعتی انقلاب کی قوت کے مظہر بن کر اس زمین پر اترے اور اپنی سرمایہ دارانہ اخلاقیات اور سامراجی حکمت عملی کے طفیل برصغیر میں دور رس سماجی تبدیلیاں پیدا کیں۔ ڈاک اور پیغام رسانی کے نظام کو مقامی باشندوں کی مرعوبیت کے عوض بہتر بنایا گیا۔ ۱۸۵۴ء میں ڈاک کے ٹکٹ جاری کئے گئے۔(۹) اسی طرح ۵ فروری ۱۸۵۵ء کو ایک خبر' بے تار برقی کے ذریعے کلکتہ سے بمبئی کے راستے مدراس دو گھنٹے میں پہنچائی گئی۔(۱۰) طباعت اور اشاعت کے وسائل کی بہتری نے بھی سماجی تغیرات میں اہم کردارا ادا کیا۔ ۱۸۳۷ء میں لیتھوگرافی کا پہلا مطبع دہلی کے قریب قائم ہوا(۱۱) اور پھر ۱۸۵۸ء میں نول کشور پریس لکھنؤ میں (۱۲)۔۔ تاہم یہاں کے تمدن میں ریلوے لائن کی تنصیب نے زیادہ سنسنی پیدا کی۔ ۱۸۵۳ء میں بمبئی اور تھانہ کے درمیان ۲۱ میل لمبی لائن بچھائی گئی۔(۱۳) اگنی دیوتا کے پجاریوں کے دلوں پر انگریزوں کی ہیبت طاری ہو گئی اور

بعض علاقوں میں تو انجن کی پوجا بھی شروع ہو گئی۔ دیگر سائنسی ایجادات کی طرح ریل گاڑی مقامی باشندوں کے لئے خوف اور مسرت کے ملے جلے جذبات کی تخلیق کا موجب تو بنی ہی' ایک دلچسپ تنفر کا محرک بھی ثابت ہوئی۔ ذات پات کے نظام میں جکڑے طبقاتی معاشرے کے لئے یہ بات تکلیف دہ تھی کہ ایک ہی گاڑی میں ٹکٹ لے کر ہر ذات اور ہر طبقے کے افراد بیٹھ سکتے تھے۔ اس سلسلے میں "اشراف" اور "رذیل" کی تخصیص نہیں تھی' چنانچہ ان دنوں ایک گیت بہت مقبول ہوا' جس کے ابتدائی بول یہ تھے :

پیسے کا لو بھی فرنگیا' دھوئیں کی گاڑی اڑائے لئے جائے

بات نہ پوچھے' برات نہ پوچھے' سب کو برابر بٹھائے لئے جائے۔(۱۵)

چاہے ذرائع حمل و نقل اور مواصلات کو استعماری نقطہ نظر سے بہتر بنایا گیا' مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان سے دور رس معاشرتی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ ہندوستان رفتہ رفتہ باہمی طور پر منضبط اور ہندوستانی آپس میں مادی اعتبار سے نسبتاً قریب آنے کے قابل ہوتے گئے' پھر بھاپ کی مدد سے کارخانے بھی قائم ہونے لگے' کلکتہ میں پٹ سن کا پہلا کارخانہ ۱۸۵۴ء میں قائم ہوا۔(۱۶) ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۲ء کے درمیان ایسے کارخانوں کی تعداد بیس تک پہنچ گئی' جبکہ ۱۹۲۶ء میں ان کی تعداد ۹۰ ہو گئی' جن میں تین لاکھ مزدور کام کرتے تھے۔(۱۷) مغلیہ دور' جاگیرداری عہد تھا اور ظاہر ہے کہ بڑے بڑے جاگیرداروں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ان "اشراف" کا کام ان زمینوں کی فصل اٹھانا تھا' جسے وہ بوتے نہیں تھے۔ ان کا یہ اعزاز شاہی خدمات کے طفیل تھا یا قوت بازو کی بدولت' چنانچہ وہ تجارت کو کم تر درجہ دیتے تھے' اس لئے یہ میدان عام طور پر ہندوؤں کے ہاتھ میں تھا۔ انگریزوں کی آمد کے ساتھ ہی ہندوستان میں سرمایہ دارانہ معاشرے کی تشکیل ہونے لگی۔ صنعت و حرفت' تجارت اور بینکوں سے وابستہ ہندوؤں پر ہی مشتمل مقامی بورژوا طبقہ ابھرنے لگا۔ زراعت کی آمدنی کم ہونے لگی' بچی کچی مسلم جاگیریں ہندو بنیوں کے پاس گروی ہونے لگیں اور مسلمان "شرفاء" کا طبقہ رفتہ رفتہ تحلیل ہونے لگا۔ ان شرفاء پر سرکاری ملازمت کے دروازے بھی بند ہونے لگے کیونکہ وہ جن علوم میں طاق تھے اور جس زبان پر دسترس رکھتے تھے' وہ سرکاری ملازمت میں اہلیت کی بنیاد نہ رہی۔ (سوائے ان رؤساء کے جنھوں نے نئے حاکموں کے مفادات کو تقویت دی اور

اعزازات پائے) اس طرح مقامی باشندوں میں فاصلہ بڑھنے لگا۔ شہر اور دیہات دو الگ الگ دنیاؤں کا درجہ اختیار کرنے لگے' مسلمانوں اور ہندوؤں میں معاشی اور سماجی تفاوت بڑھنے لگا اور ذہنی و جذباتی فاصلہ بھی ـــــ مسلمانوں کی ایک ہزار سالہ حکومت نے ہندوؤں کو مصلحت بیں اور زمانہ ساز بنا دیا تھا' اس لئے انہوں نے نئے حکمران کی حکمت عملی کے مطابق اپنے آپ کو کسی حد تک ڈھال لیا۔ انگریزوں نے مختلف قوانین کے ذریعے بظاہر ہندوؤں کے دھرم میں مداخلت کی' مثلاً عبادات میں ذات پات کی تمیز کو ممنوع قرار دیا۔ اس طرح نابالغ لڑکیوں کی شادی کو غیر قانونی قرار دیا۔ ہندو بیواؤں کی دوسری شادی کو قانونی تحفظ دیا گیا (۱۸) مگر ہندوؤں نے کسی شدید مزاحمانہ ردعمل کا اظہار نہ کیا' بلکہ راجہ رام موہن جیسے مذہبی اور سماجی مصلح نے ہندوؤں کی تعلیمی اور فکری صلاحیتوں کی تعمیر کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی فرسودہ رسموں کی تنسیخ یا ترمیم کے لئے جدوجہد کی اور اس سلسلے میں انہیں انگریزوں کی اعانت بھی حاصل تھی' ان کی کوششوں کے نتیجے میں کلکتہ میں ۱۸۱۷ء میں ہندو کالج قائم ہوا۔ (۱۹) جہاں یورپی زبانوں اور سائنس کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب گورنر لارڈ بینٹک LORD BENTICK کی کونسل نے ۷ مارچ ۱۸۳۵ء کو لارڈ میکالے کی معروف تعلیمی سفارشات کو منظور کیا' تو انگریزی اور سائنس کی تعلیم کی جانب متوجہ ہونا ہندوؤں کے لئے مشکل نہ تھا۔ ہندوؤں کا یہی وہ تفوق ہے جس نے برصغیر کی آئندہ سیاسی و سماجی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کئے۔

برصغیر میں مسلمانوں کی سیاسی اقتدار سے محرومی محض سیاسی اداروں کے انحطاط کا نتیجہ نہ تھی' بلکہ فکری اور عملی قوتوں کے ضعف نے انہیں یہ دن دکھائے تھے۔ مئی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی حقیقت میں ایک غیر منظم اور نیم دلانہ کوشش تھی' جس کا انجام غیر متوقع نہ تھا۔ اس "بغاوت" کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں پر عائد کی گئی' جس کے نتیجے میں انگریزوں کے جوش انتقام سے بچ جانے والے مسلمان سماجی اعتبار سے ہندوؤں سے بدرجہا پس ماندہ رہنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ انگریز' انگریزی زبان' مغربی معاشرت اور سرکاری ملازمت سے متنفر' خوف زدہ اور گریزاں تھے۔ ایسے میں سرسید احمد خان (۱۸۱۷ـ۱۸۹۸) مسلمانوں کے نجات دہندہ بن کر نمودار ہوئے۔

ج) ہندو، مسلم اختلافات اور برطانوی پالیسی

اسلام، ہندوستان میں داخل ہونے والا پہلا مذہب تھا، جو صدیوں کی آویزش کے باوجود اپنا مرکزی کردار قائم رکھنے میں کامیاب رہا۔ اسلام اور ہندومت دو مذاہب ہونے کے باوصف بے پناہ بعد رکھتے ہیں، چنانچہ برصغیر کے مسلمانوں اور ہندوؤں کا تاریخی اور تہذیبی شعور یکساں نہیں۔ اس کے علاوہ دونوں مذاہب میں پابندیوں کے سبب اپنے اپنے عقیدے پر قائم رہتے ہوئے نسلی اور سماجی اختلاط بھی ممکن نہیں۔ تاہم ایک ہزار برس کے میل ملاپ نے دونوں قوموں کے تمدن اور رسوم و عادات کو ایک دوسرے سے اثرات قبول کرنے پر آمادہ کیا۔ دونوں قوموں کی مشترکہ معاشرت نے برصغیر کی سب سے مقبول زبان اردو کو جنم دیا، مگر ہندو اور مسلمان برصغیر میں برضاورغبت کبھی ایک دوسرے کے قابل اعتماد اور مستقل رفیق نہ بن سکے۔ دونوں کے عقائد، تاریخی افتخار اور پھر معاشی مفادات ہم آہنگ نہ ہو سکے۔ اس صورت حال سے کسی بھی غیر ملکی حکمران قوت کو فائدہ اٹھانا چاہئے تھا۔ جی الانا رقم طراز ہیں کہ : "مراد آباد کے کمانڈنٹ لیفٹیننٹ کرنل جان کرک نے بغاوت کے بعد اپنے ایک مراسلے میں لکھا، ہماری کوشش یہ ہوگی کہ مختلف مذاہب اور فرقوں کی علیحدگی کو پوری قوت کے ساتھ برقرار رکھیں اور انہیں اس خلیج کو پاٹنے کا ہرگز موقع نہ دیں، ہندوستان میں ہماری حکومت کی پالیسی یہ ہونی چاہئے کہ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو۔ بمبئی کے گورنر الفنسٹن نے بھی اس خیال کی پوری پوری تائید کی۔ اس نے ۲۴ مئی ۱۸۵۹ء کو اپنی کونسل کی کاروائی میں لکھا "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" قدیم رومی نعرہ تھا اور اب یہی ہمارا نعرہ ہونا چاہئے۔" (۲۰) اسی طرح میری منٹو نے اپنی کتاب INDIA, MINTO AND MORLEY میں لارڈ منٹو اور سیکرٹری برائے ہند مورلے کی جو خط و کتابت درج کی ہے وہ بھی انگریزوں کی مذکورہ بالا حکمت عملی کی تصدیق کرتی ہے۔

ہندو مسلم اختلافات، اردو ہندی تنازع کی صورت میں بھی ظاہر ہوئے اور پروان چڑھے۔ اس امر کے شواہد موجود ہیں کہ یہ تنازع انگریزوں کا ہی پیدا کردہ تھا، ویسے تو ان بدیسی آقاؤں نے ۱۷۸۴ء میں ہی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال قائم کی تھی، شاہ انگلستان اور گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز جس انجمن کے مربی و سرپرست مقرر ہوئے۔ (۲۱)

جس کے سربراہ سر ولیم جونز تھے۔ اس انجمن کی غرض و غایت ہندوؤں میں مجموعی طور پر قومی افتخار پیدا کرنا اور سنسکرت زبان کی قدامت و اہمیت پر زور دینا تھا۔ رہی سہی کسر فورٹ ولیم کالج کلکتہ (۴ مئی ۱۸۰۰) کے قیام نے پوری کردی' جہاں للولال جی نے بھگوت گیتا کے ایک حصے کا ترجمہ پریم ساگر کے نام سے کیا' جسے دیوناگری رسم الخط میں شائع کر کے اردو اور ہندی کو دو علیحدہ زبانیں قرار دینے کی "علمی" بنیاد فراہم کردی گئی۔ اسی طرح اسی مصنف کی مرتبہ دیگر کتب سنگھاسن بتیسی' لطائف ہندی' راج نیتی اور سبھاس بلاس میں بھی اہتمام کیا گیا کہ عربی و فارسی کے مروجہ الفاظ سے گریز کرکے دانستہ برج بھاشا اور سنسکرت کے الفاظ شامل کئے جائیں۔ دوسری طرف راجہ رام موہن رائے کی بظاہر سماجی تنظیم "برہمو سماج" نے بھی ہندومت اور ہندو قومیت کے احیاء کے اس طرح کے اقدامات کی حوصلہ افزائی کی۔ ساتھ ہی ساتھ جگہ جگہ گئو رکھشا سبھائیں قائم ہونا شروع ہو گئیں۔ مذہبی منافرت مناظروں اور پھر مجادلوں میں تبدیل ہونا شروع ہو گئی۔ اسی فضا میں شُدھی کی تحریک نے جنم لیا جو غیر ہندوؤں کو ہندو بنانے کی تحریک تھی۔ یہ بھی سوء اتفاق ہے کہ ۱۸۸۲ء میں دیانند سرسوتی نے گئو رکھشا سبھا قائم کی اور اسی برس ایک بنگالی ہندو بنکم چندر چیٹرجی نے ایک ناول "آنند مٹھ" یعنی مسرت کی خانقاہ' لکھا' جس میں مسلمانوں اور ہندوستان میں ان کے عہد حکومت کے خلاف جی بھر کے زہر اگلا گیا۔ بھارت کا قومی ترانہ بندے ماترم بھی اسی ناول سے اخذ کیا گیا ہے۔۔۔۔۔۔ رفتہ رفتہ مسلمانوں کے عقائد' ان کے پیغمبر ﷺ کی حیات طیبہ اور مسلم تاریخ کے خلاف تحریر و تقریر کا بازار گرم ہو گیا۔ مساجد کی بے حرمتی کے واقعات عام ہونے لگے اور مسلمانوں کے مذہبی تہواروں کے جلسوں جلوسوں میں مداخلت ہونے لگی اور یوں وہ امتیازات سامنے آنے لگے جو رفتہ رفتہ عناد اور نفرت میں تبدیل ہو گئے تھے۔ تحریک خلافت اور میثاق لکھنؤ کے عارضی وقفے کے سوا برصغیر کی ان دونوں بڑی قوموں کے مابین ناقابل عبور خلیج حائل ہو گئی۔ مسلمانان برصغیر کی خوش قسمتی یہ ہے کہ انیسویں صدی کے وسط میں ہی ایسے ادارے قائم ہونے شروع ہو گئے جنہوں نے مسلمانوں کی تعلیمی اور سماجی حالت کو بدلنے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ اگرچہ دلی کالج سے بھی بعض مسلمان گھرانوں کے ایسے فرزندوں نے تعلیم پائی جنہوں نے بعد میں علم و ادب اور ثقافت و سیاست میں

نمایاں مقام حاصل کیا (سرسید' نذیر احمد' ذکاء اللہ' محمد حسین آزاد) تاہم باقاعدہ علمی تحریک کا آغاز بنگال سے ہوا جہاں ۱۸۶۰ میں نواب عبداللطیف نے نیشنل مسلم ایسوسی ایشن اور محمڈن لٹریری سوسائٹی تشکیل دی۔(۲۲) اس خطے میں جسٹس امیر علی (۱۸۴۹۔۱۹۲۸) کی قومی خدمات بھی یادگار رہیں گی۔ انہوں نے اپنی تصانیف بالخصوص SPIRIT OF ISLAM (1891) سے مسلمانوں کے فکری جمود کو توڑنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے مسلمانوں کے تعلیمی' سیاسی اور تہذیبی مفادات کے تحفظ کے لئے قابل قدر کاوشیں کیں۔ مگر شمالی ہند کے مسلمانوں کے لئے سرسید احمد خان کی کوششیں ناقابل فراموش ہیں۔ انہیں بجا طور پر دو قومی نظریے کا خالق کہا جاتا ہے جو قیام پاکستان کا محرک ثابت ہوا۔

د) سرسید احمد خان کی سیاسی خدمات

سرسید احمد خان کے تاریخی شعور اور منطقی ذہن نے ایک طرف تو مسلمانوں اور انگریزوں کو قریب لانے کی کوشش کی (اسباب بغاوت ہند' تحقیق لفظ نصاریٰ' تبیین الکلام' احکام طعام اہل کتاب) اور دوسری طرف انہوں نے مروجہ سائنسی اور مغربی علوم سے مسلمانوں کی نوجوان نسل کو آشنا کرانے کی سعی کی۔ (محمڈن اینگلو اورینٹل کالج' علی گڑھ یونیورسٹی ۱۸۷۵ء سائنٹفک سوسائٹی غازی پور ۱۸۶۲) اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے فکری انجماد کو توڑنے اور ان کی معاشرت کی اصلاح کی کوششیں مزاحمت کے باوجود کیں (رسالہ تہذیب الاخلاق) مگر ان کی سب سے بڑی خدمت مسلمانوں کے سیاسی وجود کا تحفظ ہے' جو شاید ان کی پیش بینی کے بغیر انگریزوں کی آئینی اصلاحات کی نذر ہو جاتا۔

"اسباب بغاوت ہند" میں سرسید احمد خان نے حکمرانوں کے غیظ و غضب کی پرواہ کئے بغیر ان پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ان کی اپنی بے تدبیری کا بھی دخل ہے اور ساتھ ہی ساتھ برصغیر کی سیاست میں پہلی مرتبہ امور حکومت و قانون سازی میں ہندوستانیوں کی نمائندگی کا مطالبہ کیا۔ ابتداء میں سرسید احمد خان ہندو مسلم اتحاد و اتفاق کے قائل تھے' مگر رفتہ رفتہ ہندوؤں کے تعصب اور تنگ دلی نے انہیں

اپنا موقف تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس سلسلے میں انہیں سب سے زیادہ ہندی اردو تنازع نے متاثر کیا' چنانچہ اسی تنازع کے پس منظر میں انہوں نے ۱۸۶۷ء میں بنارس کے کمشنر مسٹر شیکسپیئر سے کہہ دیا: "اب مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی' ابھی تو بہت کم ہے' آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں' بڑھتا نظر آتا ہے۔"(۲۳)

۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام' اس کے مطالبات اور انگریزوں کی جانب سے متوقع سیاسی مراعات کے پیش نظر سرسید احمد خان نے سیاسی میدان میں بھی اپنی بھرپور صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے ۱۵ جنوری ۱۸۸۳ء میں امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں لارڈ رپن کے مقامی خود اختیاری بل پر تقریر کرتے ہوئے کہا: "انتخابات کے ذریعے نمائندگی کا نظام عوام کی اکثریت کے مفادات اور نظریات کی نمائندگی کا وسیلہ ہوتا ہے' ان ممالک کے لئے جہاں ایک ہی نسل یا قوم موجود ہے' یہ نظام بلاشبہ بہترین ہے' مگر جناب والا' ہندوستان جیسے ملک میں جہاں ابھی تک ذات پات کا نظام موجود ہے' جہاں بے شمار نسلیں ہیں' جہاں مذہبی امتیازات شدید ہیں اور جہاں جدید نقطہ نظر کے مطابق تعلیم نے ابھی تک آبادی کے تمام طبقات کو ترقی کے یکساں اور متناسب مواقع فراہم نہیں کئے۔۔۔۔۔ یہ نظام مناسب نہیں۔"(۲۴)

انڈین نیشنل کانگریس نے جب وائسرائے کی کونسل کے انتخابات' اعلیٰ سرکاری ملازمتوں کے دروازے ہندوستانیوں پر کھولنے اور مقابلے کے امتحانات ہندوستان میں ہی منعقد کرائے جانے کا مطالبہ کیا' تو سرسید احمد خان نے مسلمان قوم کی تعلیمی اور سماجی پسماندگی کو پیش نظر رکھ کر ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس لکھنؤ کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کانگریس کے ان مطالبات پر کڑی تنقید کی اور اپنے اس موقف کا اعادہ کیا کہ یہ تجاویز اس ملک میں قابل عمل ہیں جہاں ایک ہی قوم بستی ہو۔(۲۵)

۱۶ مارچ ۱۸۸۸ء کو میرٹھ میں تقریر کرتے ہوئے سرسید نے کانگریس کے مطالبات اور ان حربوں کی مذمت کی' جن کے ذریعے وہ خود کو مسلمانوں کی بھی نمائندہ تنظیم قرار دیتی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اپنی قوم کو تلقین کی: "ہمیں یہی راستہ اختیار کرنا

چاہئے کہ ہم اس سیاسی ایجی ٹیشن سے خود کو الگ تھلگ رکھیں۔۔۔۔۔ ہم علم، اعلیٰ تعلیم اور دولت کے معاملے میں پسماندہ ہیں، چنانچہ ہمیں اپنے لوگوں میں علم کی ترویج کی بھرپور کوشش کرنی چاہئے۔ جب آپ تعلیم حاصل کرلیں گے اور یہی تعلیم آپ کے دلوں میں گھر کر جائے گی تو آپ خود بخود ان حقوق کے بارے میں سوچیں گے جو آپ جائز طور پر برطانوی حکومت سے حاصل کر سکتے ہیں۔"(۲۶)

اس سے پہلے فروری ۱۸۸۸ء میں سرسید احمد خان نے بعض ہندو لیڈروں کے سوالات (الزامات) کا جواب دیتے ہوئے اپنے مزاج کے برعکس جارحانہ انداز میں کہا تھا: "اگر ہمارے (ہندو) بنگالی دوست (ہماری) ادبار کی شکار قوم کو اپنے پاؤں تلے روندنا چاہتے ہیں تو انہیں یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ ہم ہتھیار ڈال دیں گے۔ وہ یاد رکھیں کہ ہم اس رسی کی مانند ہیں جو جل چکی ہے مگر اس کے بل نہیں گئے۔ حقیقت میں کانگریس نے اسلحہ کے بغیر خانہ جنگی شروع کر دی ہے۔۔۔۔۔ ہم بھی خانہ جنگی کے لئے تیار ہیں مگر ہتھیاروں کے بغیر نہیں، اگر حکومت داخلی خودمختاری دینا چاہتی ہے تو ہماری درخواست ہے کہ وہ مقابلے کا قانون منظور کرے۔ جو قوم بھی اس مقابلے میں کامیاب ہو، اس کے ہاتھوں میں داخلی خودمختاری دے دی جائے، مگر حکومت اس امتحان کے لئے ایک مختلف قسم کا قلم استعمال کرنے کی اجازت دے، وہی قلم جو ہمارے آباؤاجداد نے استعمال کیا۔"(۲۷)

الہ آباد کے جریدے پانیئر (PIONEER) میں اپنے ایک مضمون میں سرسید احمد خان نے اپنے اس نقطہ نظر کا اظہار کیا کہ نمائندہ حکومت کا نظام وہاں کامیاب ہو سکتا ہے جہاں مذہب، عادات، تہذیب و ثقافت اور تاریخی روایات میں ہم آہنگی ہو، مگر ہندوستان میں یہ ممکن نہیں، کیونکہ یہاں ایک سے زیادہ قومیں آباد ہیں۔(۲۸) چنانچہ سرسید احمد خان نے مسلمانان برصغیر کی اجتماعی شخصیت کے تحفظ کے لئے جو خیالات پیش کئے وہ حقیقت میں دو قومی نظریے کا واضح اظہار ہیں اور اسی نظریے کے منطقی نتیجے کے طور پر مسلمانوں نے جداگانہ حق رائے دہی کا مطالبہ کیا۔ دسمبر ۱۸۹۳ء میں محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن علی گڑھ نے حکومت کو جو یادداشت پیش کی، اس میں واضح طور پر مطالبہ کیا گیا کہ مسلمان رائے دہندگان، مسلم ارکان کو اور ہندو رائے دہندگان ہندو ارکان کو منتخب

کریں۔(۲۹)

ﮦ) انڈین نیشنل کانگریس کا قیام ۱۸۸۵ء

انڈین نیشنل کانگریس کے بانی ایلن آکٹیوین ہیوم (Allan Octavian Hume) برطانوی سروس کے ریٹائرڈ افسر تھے اور بقول سیتا رامیا "مسٹر ہیوم کو خیال پیدا ہوا کہ کوئی ایسا نظام چاہیے' جس کے ذریعے ہندوستانیوں کے دل کا بخار نکلتا رہے تاکہ وہ خفیہ سازشوں کی جانب مائل نہ ہوں۔(۳۰) رام گوپال نے نہ صرف اس امر کی تصدیق کی ہے بلکہ لارڈ ڈفرن کی حمایت کا ذکر بھی کیا ہے: "انڈین نیشنل کانگریس' اس وقت کے وائسرائے لارڈ ڈفرن کی عملی مدد سے قائم ہوئی' جو حکومت کے خلاف شدید مزاحمت کو آئینی راہوں پر ڈالنے کے خواہاں تھے۔"(۳۱) کانگریس کے پہلے صدر بینر جی نے بھی اپنی کتاب INDIAN POLITICS میں اس امر کی شہادت دی ہے۔(۳۲) سید حسن ریاض نے لکھا ہے: "وائسرائے سے منظوری لینے کے بعد مسٹر ہیوم انگلستان گئے' جہاں انہوں نے لارڈ رپن' لارڈ ڈلہوزی' سر جیمس کرڈ' جان برائٹ' مسٹر ریڈ' مسٹر سلیگ اور دوسرے انگریزوں سے کانگریس قائم کرنے کے متعلق مشورہ کیا۔"(۳۳) پھر یہی نہیں بلکہ ۱۸۸۵ء سے ۱۹۰۵ء تک کانگریس کے جو اکیس اجلاس ہوئے' ان میں سے چار اجلاسوں کے صدر انگریز تھے۔(۳۴) اور ان اجلاسوں میں حاضری معمول سے کہیں زیادہ تھی۔(۳۵) اس کے علاوہ کانگریس کئی برس تک انگلستان کے وزیراعظم مسٹر گلیڈ سٹون کی سالگرہ مناتی رہی اور ہر سالانہ اجلاس میں ان کے لئے مبارک باد کا ریزولیشن منظور ہوتا تھا۔(۳۶) کانگریس کا پہلا اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو "بارہ بجے دوپہر" گوکل داس تیج پال سنسکرت کالج بمبئی کے ہال میں منعقد ہوا۔(۳۷)

انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کا مقصد ایک طرف تاج برطانیہ کو وفادار اپوزیشن فراہم کرنا تھا اور دوسری طرف ہندوستانیوں کے لئے آئینی مراعات طلب کرنا۔ کانگریس رفتہ رفتہ ایک عوامی جماعت کا درجہ اختیار کر گئی' اس میں بیک وقت قوم پرستی کے شدید جذبات کے ساتھ ساتھ تاج برطانیہ سے وفاداری کا ادعا اور لبرلزم کے شانہ

بشانہ تنگ دل ہندو ذہنیت بھی کارفرما رہی۔ تشدد، عدم تشدد، محدود آزادی، کامل آزادی، مغرب پسندی، احیائے مشرق کا غلغلہ، قدامت پسندی، روشن خیالی، مغربی جمہوریت پسندی اور سوشلزم یا سوشلسٹک آئیڈیلزم کی متصادم لہریں نمایاں رہیں۔۔۔۔۔ ابتداءً برطانوی سائے میں پروان چڑھنے والے ہندوستانی صنعتی اور تجارتی مراکز کا بورژوا طبقہ مذہبی امتیاز کے بغیر اس جماعت میں شامل رہا۔ مگر سرسید احمد خان کی شدید مزاحمت نے کم از کم شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کو کانگریس میں شمولیت سے قطعی طور پر باز نہیں رکھا تو انہیں مذبذب ضرور بنایا۔

۱۸۸۵ء سے ۱۹۰۵ء تک کانگریس کے جو اکیس اجلاس ہوئے، ان میں مسلمان مندوبین ضرور شامل ہوئے، مگر ان کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہی۔ ثبوت میں درج ذیل گوشوارہ دیکھئے :

سال	کل مندوبین	مسلمان مندوبین	مقام
۱۸۸۵ء	۷۲	(۲۔ دونوں کا تعلق بمبئی سے تھا)	بمبئی
۱۸۸۶ء	۴۴۰	(۳۳۔ بنگال سے ۲۷)	کلکتہ
۱۸۸۷ء	۶۰۷	(۷۹۔ مدراس سے ۵۹)	مدراس
۱۸۸۸ء	۱۲۴۸	(۲۱۹۔ اودھ اور شمال مغربی صوبے سے ۱۵۲)	الہٰ آباد
۱۸۸۹ء	۱۸۸۹	(۲۴۸۔ بمبئی سے ۸۰)	بمبئی
۱۸۹۰ء	۶۷۷	(۱۱۶۔ شمال مغربی صوبے سے ۸۲ اور بنگال سے ۲۹)	کلکتہ
۱۸۹۱ء		(اعداد و شمار دستیاب نہیں)	ناگپور
۱۸۹۲ء	۶۲۵	(۹۱۔ اودھ اور شمال مغربی صوبے سے ۸۱)	الہ آباد
۱۸۹۳ء	۸۶۷	(۶۴۔ پنجاب سے ۵۱)	لاہور
۱۸۹۴ء	۱۱۶۳	(۲۲۔ مدراس سے ۱۷)	مدراس
۱۸۹۵ء	۱۵۸۴	(۲۳۔ بمبئی سے ۲۱)	پونا
۱۸۹۶ء	۷۸۴	(۵۴۔ بنگال سے ۴۲)	کلکتہ
۱۸۹۷ء	۶۹۲	(۵۷۔ برار سے ۵۳)	امراوتی
۱۸۹۸ء	۶۱۴	(۱۱۔ مدراس سے ہی ۱۱)	مدراس

۱۸۹۹ء	۷۸۹	(۳۱۱۔ شمال مغربی صوبے اور اودھ سے ۳۰۸)	لکھنؤ
۱۹۰۰ء	۵۶۷	(۵۷۔ پنجاب سے ۵۲)	لاہور
۱۹۰۱ء	۸۹۶	(۷۶۔ بنگال سے ۵۴)	کلکتہ
۱۹۰۲ء	۴۱۷	(۱۷۔ بمبئی سے ۱۴)	بمبئی
۱۹۰۳ء	۵۳۸	(۱۰۔ مدراس سے ۵)	مدراس
۱۹۰۴ء	۱۰۱۰	(۲۸۔ بمبئی سے ۲۵' بنگال سے ۱)	بمبئی
۱۹۰۵ء	۷۵۶	(۱۷۔ یو پی سے ۹)	بنارس

اس گوشوارے پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہی چند حقائق سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کانگریس کی اصل قوت جنوبی ہند اور کسی حد تک بنگال میں تھی۔ دوسرے یہ کہ عام طور پر جس شہر میں کانگریس کا اجلاس ہوتا تھا وہاں سے ہی بیشتر مسلم مندوبین جمع کر لئے جاتے اور سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کا ایک بھی شہر ایسا نہیں تھا جہاں سے مسلمان مندوبین ایک متعین تعداد کے ساتھ تواتر کے ساتھ اجلاس میں شریک ہوتے۔

د) بیسویں صدی کے اوائل کا برصغیر

یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ صرف بیسویں صدی کے نصف اول میں انسانی ذہن نے ارتقاء کی وہ منزلیں طے کیں' جو شاید وہ ایک ہزار برس میں بھی طے نہ کر سکا تھا۔ حقیقت یہ بھی ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی نے انسانی تمدن کی تاریخ میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ صنعتی مدنیت نے بستیوں سے انسانی تعلق کا نیا باب لکھا۔ ذرائع مواصلات کی ترقی نے بلاشبہ زمینوں کی طنابیں کھینچ لیں' نوع انسانی بظاہر ایک دوسرے کے قریب دکھائی دینے لگی۔ فکری و سیاسی انقلابات اور سائنسی ایجادات نے نہایت تیزی کے ساتھ تہذیبی تبدیلیوں کو جنم دیا۔ تعلیم کے عام ہونے کے ساتھ ساتھ انسانوں میں سائنسی اور تاریخی شعور پیدا ہوا' جس نے عالم جبر کی کئی جہات کو توڑ دیا۔ شرف آدمیت اور مساوات انسانی کے تصورات عالمگیر پیمانے پر مقبول ہوئے۔ جامد عقیدے' رنگ' نسل یا کسی اور بت کے نام پر استحصال انسانی پسندیدہ نہ رہا۔ پھر ڈارون کے نظریۂ ارتقائے انسانی' ڈاکٹر

سگمنڈ فرائیڈ کے نظریۂ نفس لاشعور اور تجزیۂ نفس اور کارل مارکس' جان سٹورٹ مل اور دیگر مفکرین کے سیاسی' معاشی اور سماجی نظریات برصغیر کے تعلیم یافتہ طبقے تک پہنچ رہے تھے۔ برصغیر کا تعلیم یافتہ طبقہ مغربی نظام تعلیم کا پیدا کردہ تھا' جو مغرب پر رشک کرنے کے ساتھ ساتھ اس سے نفرت بھی کرتا تھا (LOVE-HATE)۔ لارڈ چیمسفورڈ نے ۴ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو شاہ انگلستان کو لکھا :

> "ہمارا سابقہ ایک تعلیم یافتہ طبقے سے ہے' جس کے ۹۵ فیصدی افراد ہمارے دوست نہیں ہیں۔۔۔۔۔ اس وقت تو یہ طبقہ ہندوستان کی آبادی کا ایک معمولی سا جزو ہے' لیکن ہر سال تعلیم یافتہ گروہ کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔" (۳۹)

تعلیم یافتہ ہندوستانی اب اس تضاد کی سنگینی کو محسوس کر سکتا تھا کہ برطانوی استعمار نے اسے غلام رکھتے ہوئے بھی ۱۸۴۳ء میں ایک ایکٹ کی رو سے غلامی کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ (۴۰) اس کے علاوہ ہوس زر اور نسلی غرور میں مبتلا حکمرانوں نے ہندوستان کے کروڑوں باشندوں پر جو استبداد اور افلاس مسلط کر رکھا تھا اور جس طرح ہندوستانیوں کا معاشی استحصال کرنے کے بعد ان سے ممنونیت کی توقع رکھنے میں جو ستم ظریفی مضمر ہے' اس کا احساس تعلیم یافتہ طبقے کو بخوبی ہونے لگا تھا۔ ژاں پال سارتر نے نو آبادی میں استعماری قوتوں کے خلاف ابھرنے والے ایسے تعلیم یافتہ طبقے کے بارے میں نہایت عمدہ تبصرہ کیا ہے :

> "یورپی دانشوروں نے دیسی دانشوروں کا ایک خاص طبقہ ڈھالنے کا تہیہ کیا۔ انہوں نے ہونہار نوجوانوں کا انتخاب کیا' انہیں مغربی تہذیب کے اصولوں سے داغا' اسی طرح جیسے گرم لوہے سے داغتے ہیں' ان کے منہ میں بلند آہنگ فقرے ٹھونسے' شاندار چپچپے الفاظ بھرے جو دانتوں سے چپک کر رہ گئے' کچھ دن مادر وطن میں گزار کر انہیں گھر واپس بھیج دیا جاتا' اب ان پر سفیدی پھر جاتی تھی' وہ چلتے پھرتے دروغ تھے' جن کے پاس اپنے بھائیوں کے لئے کوئی پیغام نہ ہوتا' وہ محض بازگشت تھے۔۔۔۔۔ یہ دور ختم ہوا' اب منہ

خود بخود کھلنے لگے۔ زرد اور کالی آوازیں اب بھی ہماری انسان پسندی ہی کی بات کرتیں، مگر اب وہ ہمیں ہماری غیر انسانیت پر مطعون کرنے لگیں۔۔۔۔۔۔۔ ایسی صورت میں یورپ کو اپنے مشن کا ایقان ہوجاتا کہ بالآخر اس نے ایشیائی اقوام کو مہذب بنا دیا۔"(۴۱)

اس تعلیم یافتہ طبقے کے اندر وکلاء کا ایک طبقہ بھی ابھرا، جو ایک طرف سرکاری ملازمت کے بندھن سے آزاد تھا، دوسری طرف مغربی نظام قانون کی مراعات اور ہندوستان میں برطانیہ کی جابرانہ حکمت عملی کے تضاد سے بخوبی آگاہ تھا۔ اس طبقے نے ہندوستان کی سیاسی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کئے۔۔۔۔۔۔۔ ادھر تعلیم نے وسائل پیداوار، تمدنی اقدار اور اجتماعی نصب العین کو بدلنے کے ساتھ ساتھ حیرت انگیز طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں فاصلہ پیدا کیا، جس کے دو واضح اسباب تھے۔ ایک تو یہ کہ تعلیم یافتہ طبقے میں ملازمتوں کے حصول اور معاشی مفادات کے سلسلے میں ایک ایسی دوڑ شروع ہوئی جو تصادم کا رنگ اختیار کر گئی اور دوسرے یہ کہ ہندوؤں میں عام طور پر تعلیم نے مغرب اور مسلمانوں کی غلامی کے احساس نے ردعمل کے طور پر ماضی پرستی کے رجحان کو پروان چڑھایا اور بقول سید محمد تقی :

"احیائے ماضی کی تحریک نے قومیت کے لئے غذا مہیا کی اور جدید حالات کے ڈھانچے میں قدیم ہندوستان کے زندہ کرنے کی تحریک زور پکڑ گئی، چنانچہ باشعور طبقے میں یہ خواہش ابھری کہ ان علاقوں کو ہندو تہذیب کے دائرہ میں واپس لایا جائے۔ اس مقصد کے لئے عظیم ہندوستان کی اصطلاح وضع کی گئی۔"(۴۲)

مگر ہندوستان میں ابتداءً تعلیم یافتہ طبقہ منقسم رہا یا دو تہذیبی اور سیاسی راہوں میں سے پسندیدہ راہ کے انتخاب میں تذبذب کا شکار رہا۔ ایک طرف مسلمانوں کا ملی شعور انہیں ارضیت سے وابستہ نہیں ہونے دیتا تھا، دوسری طرف قومیت پرستی ایک تاریخی تضاد بن چکی تھی۔ اس کے علاوہ جدید سائنسی اور فلسفیانہ نظریات نے مذہبی جمود کے خلاف ردعمل پیدا کر دیا۔ تقدیر پرستی، اس دنیا میں مفلسی کے عوض عاقبت کی نعمتوں

کے حصول کا مطالبہ' عبادات کا انسانی معاملات سے کٹ کر رسومات میں تبدیل ہونا' مروجہ مذہب یا مذہب کے نادان دوست ملا کے خلاف جذبات پیدا کر رہا تھا' تاہم انھیں اس امر کا احساس بھی تھا کہ اگر مذہب کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا تو اپنے تشخص کا بنیادی حوالہ گم کرنے کے بعد مسلمان اس سرزمین کی بے رحم اکثریت کے لئے لقمہ تر ثابت ہوں گے۔۔۔۔۔ حضرت شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳-۱۷۶۲) نے حقیقی اسلامی روح اجاگر کرنے کی کوشش کی تھی' جنہوں نے معاشی مساوات اور سماجی انصاف کو اسلام کی منشا قرار دیا اور معقولیت کو دین کا حصہ۔۔۔۔۔ پھر ان کے خانوادے نے جذبہ جہاد کے ساتھ ساتھ معقولیت پسندی اور تاریخی شعور پروان چڑھانے کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا' مگر برطانوی استعمار کے بارے میں واضح طور پر مسلمان علماء کے دو دھڑے تھے' ایک کے قائد سرسید احمد خان تھے اور دوسرے مکتب کی قیادت شاہ ولی اللہ کے خاندان کے بعد مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ہاتھ آئی' جنہوں نے ۱۸۶۷ء میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی۔ یہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے علماء فطری طور پر برطانوی استعمار کے خلاف تھے اور شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مسلم لیگ کے مقابلے میں (جو سرسید کے مکتب فکر کی نمائندہ تھی) کانگریس کی حمایت کی۔

بہرطور حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں کی تنگ دلی اور حرکت دشمنی (ان کے عقیدے کے مطابق حقیقت اصلیہ یعنی برہمن ساکت ہے) کے باوجود اور مسلمانوں کے دینی جذبات اور ملی حمیت کے باوصف سماجی و تہذیبی تغیرات نے نظام عقائد کو متاثر کیا اور علامہ عبداللہ یوسف علی نے بجا طور پر کہا ہے:

> "کسی قوم کی مذہبی زندگی اور مذہبی خیالات پر اس کی تعلیم اور اقتصادی و معاشرتی ماحول میں تغیر و تبدل کا اثر ہونا لازمی ہے۔ ہم اپنی اندرونی زندگی کو ایک مقدس مقام کی طرح بیرونی اثرات سے محفوظ رکھنے کی کتنی ہی کوشش کریں' لیکن یہ اثرات اپنے لئے اس طرح راستہ بنا لیتے ہیں جس طرح شعاعیں گا تھک گرجاؤں میں چند چھوٹے چھوٹے روزنوں کے ذریعے سے داخل ہو جاتی ہیں۔" (۴۴)

ادھر ہندوستان کو غلام بنانے کے لئے برطانیہ نے انتظامیہ کا جو وسیع جال پھیلا رکھا تھا اور بھاری فوج متعین کر رکھی تھی' اس کے اخراجات بھی ہندوستانی خزانے سے ادا کئے جاتے تھے۔(۴۴) اس کے علاوہ ہنگامی صورت حال میں قرض بھی اپنے نام منتقل کر لیا جاتا تھا۔ ہندوستانی سرمائے کے انخلاء کو تو صنعتی ضرورتوں کے تابع بیان کیا جاتا تھا' لوٹ کھسوٹ کے کھلے مواقع سے بھی گریز نہیں کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جاگیرداروں' سرمایہ داروں' تاجروں' بنیوں اور ذخیرہ اندوزوں کے ساتھ ساتھ راجاؤں' مہاراجاؤں اور نوابوں کا ایک ایسا دیسی طبقہ موجود تھا جو اپنے ہم وطنوں کی کھال اتارنے میں مصروف تھا اور اس عمل میں حاکموں کی تائید بھی انہیں حاصل تھی۔

ز) تقسیم بنگال اکتوبر ۱۹۰۵ء

بنگال ساڑھے آٹھ کروڑ باشندوں پر مشتمل ایسا صوبہ تھا' جہاں ہندو اکثریت میں تھے' مگر مسلمان اقلیت بھی کروڑوں میں تھی۔ اقتصادی اعتبار سے بھی یہ صوبہ سب سے بڑی بندرگاہ کلکتہ' زرخیز زمین اور پانی کی افراط کے باوجود پسماندہ تھا' مگر سیاسی شعور اور ایجی ٹیشن میں باقی تمام ہندوستان سے آگے تھا اور یہ امر بھی معنی خیز ہے کہ ہندوستان کی دو بڑی سیاسی جماعتوں کانگریس اور مسلم لیگ کا قیام بنگال میں ہی عمل میں آیا۔۔۔۔۔

لارڈ کرزن نے بظاہر انتظامی وجوہ کی بناء پر ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو مغربی بنگال (ہندو اکثریتی صوبہ) اور مشرقی بنگال (مسلم اکثریتی صوبہ) میں بنگال تقسیم کر دیا۔ اس کے پس پردہ سیاسی مقاصد بھی ہوں گے' مگر اس تقسیم سے مسلمانوں کو فائدہ ہوا' کیونکہ ایک طرف انہیں ہندو استحصال سے نجات ملنے کا امکان پیدا ہوا اور دوسری طرف ایک خطے میں ان کے یکجا ہونے سے ان میں سیاسی بیداری کے ساتھ ساتھ قوتِ عمل بھی پیدا ہوئی۔ جگہ جگہ نواب سلیم اللہ خان آف ڈھاکہ اور ان کے ساتھیوں کی قیادت میں مسلمانوں کے اجلاس ہوئے' جس میں برطانوی حکومت کے اس اقدام کا شکریہ ادا کیا گیا (اگرچہ رام گوپال نے الزام عائد کیا ہے کہ نواب سلیم اللہ خان کو ایک لاکھ پونڈ کا قرض نسبتاً کم شرح سود پر دے کر ان کی حمایت خریدی گئی۔)(۴۵) بعض سرکردہ مسلمانوں نے اس اقدام کی مخالفت بھی کی' جن میں سید امیر علی اور ان کی تنظیم محمڈن ایسوسی ایشن بھی شامل تھی۔(۴۶) مگر ہندوؤں نے تو صف ماتم بچھا لی۔ ان کی مخالفت نے عام مسلمانوں کو

ششدر کر دیا' دراصل ہندوؤں کا طبقہ بنگال میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے کے حالات چاہتا تھا' ان کا متوسط طبقہ اپنے معاشی مفادات اور ملازمتوں کی خاطر مشرقی بنگال کی منڈی اپنے ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہندوؤں کو خدشہ تھا کہ مشرقی بنگال کی بندرگاہ چٹاگانگ' کلکتہ کی حریف بن جائے گی۔(۴۷) ہندوؤں کے شدید ردعمل نے مسلم قومیت کو مذہبی تشخص دے دیا' کیونکہ ہندوؤں نے جب سودیشی کی تحریک (برطانوی مال کے بائیکاٹ کی تحریک) چلائی اور ہڑتالیں کیں تاکہ تقسیم بنگال کو منسوخ کردیا جائے تو خاص طور پر ان مسلمان مزدوروں اور کارکنوں پر حملے کئے گئے جو ان کے ایجی ٹیشن میں شریک نہیں ہوئے تھے۔(۴۸) ہندوؤں کے اس طرز عمل نے مسلمانوں کو متنبہ کر دیا تھا' چنانچہ مسلم لیگ نے اپنے قیام کے فوراً بعد اس مسئلے میں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے کوششیں شروع کر دیں اور ستمبر ۱۹۰۸ء کو ایک قرارداد میں تقسیم بنگال کو ایک طے شدہ امر قرار دیا۔(۴۹) ہندوؤں کا یہ طرز عمل کچھ اس لئے بھی غیر منصفانہ تھا کہ اس سے پہلے بھی ہندوستان کے صوبوں میں تغیر و تبدل ہوتا رہا تھا' خاندیش جیسا چھوٹا صوبہ بھی ۱۸۷۰ء اور ۱۸۹۹ء کے درمیان دو مرتبہ تقسیم ہوا۔ دہلی ڈویژن کو پنجاب میں شامل کیا گیا۔ شمال مغربی صوبے کے کچھ علاقے وسطی صوبوں کو دے دیئے گئے اور اودھ کی انتظامی اکائی ختم کر کے اسے شمال مغربی صوبے میں شامل کر دیا گیا۔(۵۰) بہرطور ہندوؤں کے پر تشدد ایجی ٹیشن کے پیش نظر برطانوی حکومت نے مسلمانوں کے جذبات کا خیال رکھے بغیر نومبر ۱۹۱۱ء میں یہ تقسیم منسوخ کر دی' جس پر نواب وقارالملک نے لکھا کہ اس سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ حکومت کے کسی وعدے پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح نواب سلیم اللہ خان نے اسے تشدد کی سیاست کی فتح قرار دیا۔(۵۱)

ج) شملہ وفد

سر آغا خان سوم کی قیادت میں سرکردہ مسلمانوں کا ایک وفد یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو شملے میں جا کر وائسرائے لارڈ منٹو سے ملا۔ یہ ملاقات دور رس نتائج کی موجب بنی۔ مسلم لیگ کا قیام' جداگانہ حق رائے دہی اور قرارداد پاکستان اسی ملاقات کے منطقی نتائج ہیں۔ اس ملاقات کے بعد یہ متنازعہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ کیا یہ انگریز حاکموں کے ایماء پر برطانیہ

کے وفادار مسلمانوں کی وائسرائے سے ملاقات تھی؟۔۔۔۔۔ جہاں تک حاکموں کی خدمت میں یادداشت پیش کرنے کا معاملہ ہے تو اڑیسہ کے مسلمانوں نے تو ۱۸۷۵ء میں ملکہ وکٹوریہ کو ایک عرضداشت پیش کی تھی، جس میں انہوں نے اپنی محرومیوں کا ذکر کرنے کے بعد اس کا اختتام یوں کیا تھا:

"اب ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں رہا یا تو سمندر میں جا کر ڈوب جائیں یا اڑیسہ کے پہاڑوں میں کھو جائیں۔" (۵۲)

اسی طرح وقتاً فوقتاً مسلم رہنما، حکمرانوں کو اپنے مطالبات کے سلسلے میں خطوط بھی لکھتے رہے۔ اس پس منظر میں ڈاکٹر راجندر پرشاد (۵۳)، لال بہادر (۵۴)، رام گوپال (۵۵)، دمودر پی سنگھل (۵۶)، وائی فری گانکوفسکی اور ایل آر گورڈن پولانکایا (۵۷) وغیرہ کا یہ الزام مبالغہ آمیز دکھائی دیتا ہے کہ ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ کے پرنسپل آرچی بالڈ موسم گرما کی تعطیلات میں شملہ پہنچے۔ وہاں انہوں نے وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری کرنل ڈنلپ سمتھ اور دیگر حکام کے ساتھ مل کر یہ منصوبہ بنایا اور پھر ۱۰ اگست ۱۹۰۶ء کو نواب محسن الملک کو خط لکھا۔ "وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری کرنل ڈنلپ سمتھ نے مجھے اطلاع دی ہے کہ عزت مآب جناب وائسرائے مسلم وفد سے ملاقات کے لئے تیار ہیں۔" اسی خط میں آرچی بالڈ نے خط اور یادداشت کے متن سے متعلق بھی ہدایات دیں۔۔۔۔۔ مسلمانوں کی اس دور کی سیاست میں آرچی بالڈ کے عمل دخل، شملے میں ان کی مصروفیات اور ان کے مذکورہ خط کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آرچی بالڈ نے نواب محسن الملک کے خط محررہ ۴ اگست ۱۹۰۶ء کے جواب میں مذکورہ بالا خط لکھا تھا۔(۵۸) اسی طرح پاکستان کے قومی میوزیم کراچی میں وہ خط محفوظ ہے (این ایم ۱۹۶۸۔۲۔۲۸۸) جو نواب محسن الملک نے ۱۸ جنوری ۱۹۰۳ء کو نواب وقارالملک کو لکھا تھا اور جس میں اس قسم کا وفد تشکیل دینے کا عندیہ ظاہر کیا تھا۔۔۔۔۔
۲۰ جولائی ۱۹۰۶ء کو جب دارالعوام (انگلستان) میں سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہند، جان مورلے نے تقریر کرتے ہوئے ہندوستان کے لئے مجوزہ آئینی اصلاحات کی جانب اشارہ کیا تھا تو پارلیمانی نظام کی بے رحم اکثریت سے خوف زدہ مسلمانوں کا اضطراب فطری تھا،

چنانچہ نواب محسن الملک نے نہایت عجلت کے ساتھ مسلم مفادات کے تحفظ کے لئے اقدامات کئے، جنہیں بوجوہ بدیسی حکام نے پسند کیا ہو گا' مگر اسے مسلم انگریز گٹھ جوڑ نہیں کہا جا سکتا۔۔۔۔۔۔ اگر ابوالکلام آزاد کے حوالے سے رام گوپال کی بیان کردہ حکایت کو درست مان لیا جائے (۵۹) تو یورپ جاتے ہوئے عدن سے سر آغا خان کو لوٹنا پڑا۔ یاد داشت سید بلگرامی نے تیار کی' جس پر چار ہزار مسلمانوں کے دستخط کرائے گئے اور ۳۵ سرکردہ مسلمانوں پر مشتمل وفد یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو شملہ جا کر وائسرائے لارڈ منٹو سے ملا اور مندرجہ ذیل مطالبات پیش کئے :

۱۔ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے لئے مناسب اور معقول نمائندگی

۲۔ ملازمتوں کے سلسلے میں مقابلے کے عنصر کا خاتمہ

۳۔ ہر ہائی کورٹ اور چیف کورٹ میں مسلمانوں کی نمائندگی

۴۔ پنجاب کی طرح باقی علاقوں کی میونسپل کمیٹیوں میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ نیابت

۵۔ لیجسلیٹو کونسلوں کے لئے مسلمان رائے دہندگان کی اہلیت کا مخصوص معیار (زمیندار وکلاء' تاجر' اہم مفادات کے نگران' میونسپل کمیٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے مسلم ارکان اور یونیورسٹیوں کے مسلمان گریجویٹ)۔۔۔۔۔ وائسرائے نے ان تمام معروضات کے سلسلے میں مثبت رویہ ظاہر کیا۔۔۔۔۔ ۱۹۰۹ء کی منٹو مارلے اصلاحات اس کی گواہی دیتی ہیں۔

ط) مسلم لیگ کا قیام دسمبر ۱۹۰۶ء

اگرچہ بنگال' علی گڑھ' پنجاب اور بعض دوسرے علاقوں میں مسلمانوں کی تعلیمی' سماجی اور ادبی انجمنیں موجود تھیں' تاہم ملکی اور قومی سطح پر مسلمان اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے ایک تنظیم کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ تقسیم بنگال پر ہندوؤں کے ردعمل اور مجوزہ آئینی اصلاحات کے پیش نظر یہ ضرورت اور بھی بڑھ گئی تھی اور جب سرکردہ مسلمان مختلف علاقوں سے ۱۵' ۱۶ ستمبر ۱۹۰۶ء کو لکھنؤ میں جمع ہوئے تاکہ شملہ وفد کی یادداشت کو قطعی شکل دی جا سکے' نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلمانوں کی ملک گیر تنظیم کے سلسلے میں صلاح مشورہ کیا۔

اس میٹنگ میں ایسی تنظیم کے سلسلے میں اصولی طور پر اتفاق کر لیا گیا اور نواب محسن الملک کو عارضی طور پر سیکرٹری منتخب کیا گیا۔(۶۰) ادھر ڈھاکہ کے نواب سلیم اللہ نے جو اپنی آنکھ کے اپریشن کی وجہ سے شملہ وفد میں شریک نہ ہو سکے تھے' نومبر ۱۹۰۶ء میں مسلم آل انڈیا کنفیڈریسی کی سکیم پیش کی اور مسلمانوں کے ممتاز رہنماؤں کو اس پر غور کرنے کے لئے ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکہ آنے کی دعوت دی۔(۶۱) چنانچہ اسی روز شاہ باغ ڈھاکہ میں نواب وقار الملک کی صدارت میں یہ اجلاس منعقد ہوا جس میں آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کی قرار داد نواب سلیم اللہ خان نے پیش کی۔ حکیم اجمل خان' مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خان نے اس کی تائید کی۔ اس قرار داد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے مندرجہ ذیل مقاصد متعین کئے گئے :

الف) ہندوستان کے مسلمانوں میں برطانوی حکومت کے لئے وفاداری کے جذبات پروان چڑھانا اور حکومت کے اقدامات کے سلسلے میں اس کی منشاء یا ارادے کے بارے میں کسی غلط فہمی کو رفع کرنا۔

ب) ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی مفادات کا تحفظ کرنا اور انہیں پروان چڑھانا اور ان کی ضرورتوں اور امنگوں کو باوقار طریقے سے حکومت تک پہنچانا۔

ج) ہندوستان کے مسلمانوں میں دوسری اقوام (فرقوں) کے بارے میں مخاصمت کے احساس کو روکنا' لیگ کے دیگر مذکورہ بالا مقاصد کو نقصان پہنچائے بغیر۔(۶۲)

آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ۲۹ اور ۳۰ دسمبر ۱۹۰۷ء کو کراچی میں سر آدم جی پیر بھائی کی صدارت میں منعقد ہوا۔(۶۳) جس میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تاکہ آل انڈیا مسلم لیگ کا آئین اور قواعد و ضوابط ترتیب دئے جا سکیں۔ اسی اجلاس میں پنجاب مسلم لیگ کے الحاق کا مسئلہ بھی پیش ہوا' جس کے دو دھڑے میاں فضل حسین اور میاں شفیع کی قیادت میں اپنے اپنے وجود کو تسلیم کرانے میں مصر تھے' مگر بحث کے بعد دونوں دھڑوں سے الحاق کر لیا گیا۔(۶۴) یہاں یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہئے کہ آل

انڈیا مسلم لیگ کے قیام سے پہلے ۱۹۰۶ء میں پنجاب میں میاں فضل حسین کی تشکیل کردہ مسلم لیگ موجود تھی۔

مسلم لیگ نے اپنے قیام کے فوراً بعد کانگریس کی ایجی ٹیشنل سیاست کے مقابلے میں اپنی قانون پسندی اور تاج برطانیہ سے اپنی وفاداری پر کچھ اس شدومد کے ساتھ زور دیا کہ مخالفین کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ انگریزوں نے ہندوستانی قومیت اور جنگ آزادی کو نقصان پہنچانے کی خاطر مسلمانوں میں چند وفادار اور کاسہ لیس منتخب کر لئے ہیں جو مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے بدیسی آقاؤں کا متعین کردہ کردار بخوبی ادا کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ بہرطور آل انڈیا مسلم لیگ کا دوسرا سالانہ اجلاس ۳۰،۳۱ دسمبر ۱۹۰۸ء کو امرتسر میں زیر صدارت سید علی امام منعقد ہوا، جس میں تقسیم بنگال کی حمایت میں ایک زور دار قرارداد منظور کی، مگر زیادہ تر قراردادیں مجوزہ منٹو مارلے اصلاحات کے بارے میں تھیں، جن میں نہایت ادب کے ساتھ مسلمان قوم کے لئے تحفظات کا مطالبہ کیا گیا تھا۔(۶۵)

ی) منٹو مارلے اصلاحات ۱۹۰۹ء

۱۹۰۹ء میں منٹو مارلے اصلاحات کا اعلان ہوا، جن کے ذریعے پہلی مرتبہ صوبائی قانون ساز اسمبلی اور وائسرائے کونسل میں غیر سرکاری منتخبہ ارکان کی اکثریت کو روا رکھا گیا۔ اگرچہ رائے دہندگان محدود تھے، تاہم پہلی مرتبہ براہ راست انتخاب کا طریق تسلیم کیا گیا۔(۶۶) مسلمانوں سے شملے میں کیا گیا وعدہ بھی پورا کیا گیا اور انہیں جداگانہ حق نیابت دیا گیا۔۔۔۔۔ سید ہاشمی فرید آبادی نے بھی اس پر تبصرہ یوں کیا ہے :

> "یہ تجویز تو شاید کسی انگریز سیکرٹری کے دماغ کی کاشتہ تھی، لیکن بے شبہ ہندو تعصبات کے ظہور اور مسلمانوں کے ملی محسوسات نے ان کی آبیاری کی۔"(۶۷)

ک) ہندوؤں، مسلمانوں اور انگریزوں کے باہمی تعلقات میں تبدیلی

۱۹۱۰ء میں لارڈ منٹو کی جگہ لارڈ ھارڈنگ وائسرائے مقرر ہوئے۔ انہوں نے بوجوہ جون ۱۹۱۱ء میں اپنی کونسل کے ایک رکن سرجان جینکنز کی تجویز فوراً قبول کرلی کہ تقسیم بنگال کے فیصلے کو منسوخ کر دیا جائے۔(۶۸) چنانچہ ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کو شاہ برطانیہ نے

دہلی میں اپنے جشن تاجپوشی کے موقع پر اس فیصلے کا اعلان کیا' جس کے بعد مسلمانوں کو احساس ہوا کہ انگریز کو اپنے لفظوں اور وعدوں کا پاس نہیں' چنانچہ مسلم لیگ کونسل نے اپنے اجلاس منعقدہ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۲ء بمقام بانکی پور زیر صدارت سر آغا خان ایک قرار داد کے ذریعے برطانوی حکومت سے وفاداری کے اظہار کے ساتھ ساتھ حکومت خود اختیاری کا مطالبہ کر دیا۔ مظہر الحق کے اعتراض اور محمد علی جناح کی طرف سے اعتراض کی تائید کے بعد وفاداری کے اظہار کو غیر ضروری قرار دیا گیا۔ اسی اجلاس میں محمد علی جناح نے مسلم لیگ کو مبارک باد پیش کی کہ وہ یہ مطالبہ (حکومت خود اختیاری) کر کے کانگریس سے آگے بڑھ گئی ہے۔(۶۹) اس سے پہلے مارچ ۱۹۱۲ء کے اجلاس میں مسلم لیگ نے ٹریپولی کے ساحل پر اٹلی کے حملے کی مذمت کی اور یہ امید ظاہر کی کہ یورپی طاقتیں اٹلی کو ٹریپولی پر ترکیہ کے اقتدار اعلیٰ کے تسلیم کرانے میں ناکام نہیں رہیں گی۔(۷۰) پہلی جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴) نے برصغیر کے سیاسی نقشے کو بھی متاثر کیا۔ ہندوستانیوں کے دلوں سے انگریزوں کے ناقابل تسخیر ہونے کا احساسا کسی حد تک نکل گیا' ادھر ملک سے زرعی اجناس کے انخلاء نے قحط کے آثار پیدا کر دیئے۔ ادھر مسلمانوں میں ترکیہ کے خلاف برطانوی حکمت عملی کے خلاف رد عمل' تحریک خلافت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ایسے جذبات نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو عارضی طور پر قریب کر دیا۔ اس صورت حال سے مہاتما گاندھی نے فائدہ اٹھایا۔ ان کی شخصیت بلاشبہ اپنی اسراریت اور سادگی کے سبب بڑی کشش رکھتی تھی' مگر ان کی ذات اور نظریات تضادات سے خالی نہیں تھے۔ وہ بظاہر انسان دوست تھے' مگر بعض جذباتی مواقع پر جارحانہ ہندو قوم پرستی کے جذبات چھپا نہیں سکتے تھے۔ مثلاً ایک موقع پر انہوں نے کلکتہ کے اخبار "اسٹیٹسمین" میں لکھا :

> "گئو پوجا" ہندو کی فطرت میں داخل ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے ہندو باوجود اپنی نرم روی کے عیسائیوں اور مسلمانوں کو گئو ہتیا سے باز رکھنے کے لئے تلوار استعمال کرنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔(۷۱)

اس طرح اہنسا کے اس پجاری نے پاکستان کے مطالبے کو نامنظور کرتے ہوئے ہندوستان کو خونی غسل دینے کی جو دھمکی دی تھی' اسے لارڈ ویول نے اپنے

روزنامچے میں ۲۷ اگست ۱۹۴۶ء کو یوں درج کیا :

"گاندھی نے کہا کہ اگر ایک خونی غسل بھی ضروری ہوا تو وہ عدم تشدد کے باوجود دیا جائے گا۔" (۷۲)

اسی طرح گاندھی ذات پات کے قائل بھی تھے۔ اچھوتوں کے لئے تحفظات کے مخالف تھے' مگر انہیں ہریجن بھی کہتے تھے' انہی کی بستیوں میں رہتے بھی تھے' آزادی کی جنگ لڑنے والے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو تجرد کی زندگی اور جنسی ترک سے کام لینے کو کہتے تھے۔ (۷۳) مگر راتوں کو بوجوہ اپنی حسین بیساکھیوں سے برہنہ حالت میں لپٹ کر سوتے تھے۔ (۷۴) جب فیصلے کرنے کا وقت ہوتا' وہ کانگریس کے سب سے بڑے رہنما ہوتے' جب ان کی ذمہ داری قبول کرنے کا وقت آتا تو وہ کانگریس کے عام رکن بھی نہ ہوتے'۔۔۔۔۔۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ برطانوی استعمار برصغیر کے جس رہنما سے سب سے زیادہ خائف اور مرعوب رہا وہ مہاتما گاندھی ہی ہیں اور اس سرزمین سے انگریزوں کو نکالنے میں انہوں نے بہت بڑا کردار ادا کیا۔ ان کے مقابل مسلمانوں کو قائداعظم محمد علی جناح (۱۸۷۶ـ۱۹۴۸) کی صورت میں ایک ایسے رہنما ملے جنہوں نے اپنی دور اندیشی' مستقل مزاجی اور خود اعتمادی کی بدولت مسلمانوں کے خلاف ہر چال کو ناکام بنا دیا۔ گاندھی کی طرح قائداعظم بھی ایک وکیل تھے' مگر وہ چالاکی اور دوغلے پن سے نفرت کرتے تھے۔ ان کے لباس' رہن سہن' عادات اور فکر پر مغرب کی چھاپ گہری تھی' مگر انہوں نے مغربی سامراج کے اس زعم کو پاش پاش کر دیا کہ وہ ہندوستان کے ہر باشندے کو خرید سکتے ہیں یا دھمکا سکتے ہیں۔ اسی طرح قائداعظم' گاندھی کی طرح "اندرونی یا روحانی آواز" کے بھی منتظر نہیں رہتے تھے' نہ ہی وہ آئین اور قانونی حدود سے تجاوز کرنا پسند کرتے تھے۔ عمر کے آخری برسوں کے سوا انہیں گاندھی کی طرح عوامی رہنما بننے اور رابطہ عوام کی مہم چلانے کا شوق بھی نہیں تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں عام طور پر ہندو اور مسلمان قومی رہنماؤں کا رویہ برطانیہ کے ساتھ مصالحانہ رہا' مگر انگریزوں نے اس رویے کا جواب رولٹ ایکٹ ۱۹۱۹ء کے نفاذ کی صورت میں دیا' جس کے ذریعے بغاوتوں اور اندرونی شورشوں کو کچلنے کے نام پر حاکموں نے لامحدود "قانونی" اختیارات حاصل کر لئے۔۔۔۔۔۔ قائداعظم محمد علی جناح نے وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ کو ۲۸ مارچ ۱۹۱۹ء کو ایک

خط لکھ کر مطلع کیا کہ وہ بطور احتجاج امپیریل لیجسلیٹو کونسل کی رکنیت سے مستعفی ہو رہے ہیں اور ساتھ ہی سخت لب و لہجے میں لکھا :

"حکومت ہند کی طرف سے رولٹ بل کی منظوری اور آپ کی طرف سے اس کی تصدیق نے برطانوی انصاف پر سے عوام کا اعتماد ہلا کر رکھ دیا ہے۔۔۔۔ اس طرح آپ کی حکومت نے ان اصولوں کو خاک میں ملا دیا ہے' جس کے لئے برطانیہ عظمیٰ نے جنگ لڑی تھی۔ انصاف کے بنیادی اصولوں کو اس وقت جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا گیا ہے اور عوام کے آئینی حق کو اس وقت پامال کیا گیا ہے' جب ریاست کو کوئی حقیقی خطرہ نہیں تھا۔" (۷۵)

مہاتما گاندھی نے بھی ۷ اپریل ۱۹۱۹ء کو رولٹ ایکٹ کی منظوری کے خلاف ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ ادھر پہلی جنگ عظیم کے دوران میں قائداعظم کے قوم پرستانہ جذبات کی بدولت مسلم لیگ اور کانگریس کا مشترکہ اجلاس لکھنؤ میں ۱۹۱۶ء میں منعقد ہوا اور وہاں باہمی مراعات کا ایک سمجھوتہ ہوا جسے "میثاق لکھنؤ" کا نام دیا گیا۔ اس کے مطابق مستقبل کے آئین ہند کے بنیادی خدوخال طے پائے اور مسلمانوں کو دستور ساز اسمبلی میں ایک تہائی اور صوبائی اسمبلیوں میں بھی اس طرح نشستیں دینے کا فیصلہ کیا گیا کہ مسلم اکثریتی صوبوں میں آبادی کے مقابلے میں کم نشستیں مگر اقلیتی صوبوں میں زیادہ نشستیں مخصوص کی گئیں۔۔۔۔ ہندوستان میں دہشت پسند سرگرمیوں کا آغاز ہو چکا تھا' جس کا سب سے زیادہ زور تو بنگال میں تھا' مگر پنجاب میں بھی تعلیم یافتہ نوجوان' کسانوں اور مزدوروں کے شانہ بشانہ ایسی زیر زمین تحریک میں شامل ہو چکے تھے۔ ان کی سرگرمیوں سے جہاں انگریز مضطرب تھے' وہاں کانگریس اور مسلم لیگ بھی خوش نہیں تھی۔

ل) جلیانوالہ باغ کا سانحہ ۱۹۱۹ء

پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر ہی برصغیر کی فضا میں کشیدگی اور ہلچل کے آثار تھے' جن میں ہندوستانی فوجیوں کی واپسی' بے روزگاری' معاشی بحران' حاکموں کے رعونت بھرے رویے اور دہشت پسند سرگرمیوں نے اضافہ کر دیا۔(۷۶) پنجاب اور وسطی ہند

میں انگریزوں سے نفرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ادھر حکومت نے اپریل ۱۹۱۹ء میں گاندھی کو گرفتار کر لیا۔ سیاسی جماعتیں پہلے ہی مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات (۱۹۱۹) پر اپنی مایوسی اور رولٹ ایکٹ کے نفاذ پر غصے کا اظہار کر چکی تھیں' چنانچہ امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں جو سانحہ پیش آیا وہ غیر متوقع تو نہیں تھا البتہ اتنا سنگین تھا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد یہ پہلا بڑا حادثہ تھا جس میں انگریزوں نے بے رحمی کے ساتھ ہندوستانیوں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنایا اور بلاشبہ اس واقعے نے آزادی ہند کو قریب تر کر دیا۔۔۔۔۔ ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں نہتے شہریوں پر جنرل ڈائر اور اس کے فوجی دستے نے گولیاں چلانا شروع کیں اور اس وقت فائرنگ بند کی جب اسلحہ ختم ہو گیا۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۳۷۹ ہندوستانی ہلاک اور ۱۲۰۰ زخمی ہوئے۔(۷۷) لیکن جی الانا نے لکھا ہے کہ کچھ تخمینوں کے مطابق دو ہزار ہندوستانی باشندے جام اجل پی چکے تھے۔(۷۸) جنرل ڈائر نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ کئی دن تک ہندوستانیوں کو اس جگہ سے گھٹنے کے بل رینگ کر گزرنے کا حکم دیا' جہاں ایک انگریز عورت کی بے حرمتی ہوئی تھی۔ بعد میں ایک تحقیقاتی کمیشن کے سامنے بیان دیتے ہوئے برملا کہا "میں مجمع کو منتشر کرنا نہیں' پنجابیوں کو ایک واضح سبق سکھانا چاہتا تھا۔"(۷۹) اسی طرح جب اس سے سوال کیا گیا کہ اس نے زخمیوں کے لئے طبی امداد طلب کی تھی تو اس نے کہا "یہ میرا کام نہیں تھا۔"(۸۰) یہی نہیں بلکہ جب انکوائری کے نتیجے میں جنرل ڈائر کو اس کی کمان سے سبکدوش کیا گیا تو برطانوی دارالامراء نے اس کے حق میں قرار داد منظور کی اور انگلستان میں اس کی "مدد" کے لئے چندہ جمع کیا گیا۔۔۔۔۔ مگر بقول چودھری محمد علی "ڈائر کا مقصد طاقت کے ظالمانہ مظاہرے سے لوگوں کو دہشت زدہ کرنا تھا' مگر نتیجہ عین برعکس نکلا۔(۸۱) بہر طور پنجاب میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا اور بعض علاقوں پر تو بمباری بھی کی گئی۔ یوں انگریزوں نے اس فریب کا پردہ خود ہی چاک کر دیا کہ وہ دنیا کی مہذب ترین قوم کے افراد ہیں۔۔۔۔۔ اور بقول سر ظفر اللہ خان "اس میں شک نہیں کہ ۱۹۱۹ء کے مارشل لاء اور خصوصاً جنرل ڈائر کی وحشیانہ کارروائیوں نے ہندوستان سے برطانوی راج کی صف لپیٹ دی۔"(۸۲)

م) تحریک خلافت

ترکوں سے مسلمانان برصغیر کی دلچسپی کے اسباب دینی' سیاسی اور نفسیاتی

تھے۔ جب جنگ طرابلس ہوئی تو مسلمانان برصغیر نے ترکوں کی فتح کی دعائیں مانگیں۔ اسی طرح پہلی جنگ عظیم میں جب ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا تو ہند کے غلام مسلمانوں نے پھر ترکوں کے لئے ہمدردی اور محبت کے جذبات محسوس کئے۔ جنگ کے دوران میں بھی مسلمان حکومت برطانیہ پر زور دیتے رہے کہ وہ دنیائے اسلام میں خلافت کے مرکز ترکیہ سے متعلق ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات کا احترام کرے اور ایسی یقین دہانیاں حاکموں کی طرف سے کرائی جاتی رہیں' مگر جنگ کے خاتمے پر جب برطانیہ کی طرف سے ترکی کے خلاف انتقامی کارروائی کا آغاز ہوا تو سارے برصغیر کے مسلمانوں میں تشویش پیدا ہوئی اور یوں خلافت کمیٹی وجود میں آئی' جس کے ممتاز ارکان مولانا محمد علی جوہر' مولانا شوکت علی' حکیم اجمل خاں' مولانا ابوالکلام آزاد' ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو تھے۔ قائداعظم محمد علی جناح مسلمانوں کے اس سلسلے کے بعض مطالبات سے ہمدردی رکھنے کے باوجود کسی عوامی تحریک چلانے کے حق میں نہ تھے۔ خلافت کانفرنس نے ۲۷ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو یوم خلافت منانے کا اعلان کیا۔(۸۳) اور دہلی میں ۲۳ نومبر کو ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ اجلاس طلب کیا' جس کے بعد مہاتما گاندھی کے ہاتھ میں تحریک خلافت کی قیادت آگئی اور انہوں نے مسلمانوں کے جوش و خروش کو خوب استعمال کیا۔ آل انڈیا جمعیت العلماء نے بھی گاندھی کی عدم تعاون اور ترک موالات کی تحریک کے حق میں فتویٰ جاری کیا۔ اس سے پہلے گاندھی اور خلافت کانگریس عوام سے اپیل کرچکی تھی کہ وہ فتح کی پریڈوں میں شرکت نہ کریں' سرکاری خطابات واپس کردیں اور انگریزوں کے قائم کردہ اداروں کا مقاطعہ کریں۔ اس سے صرف مسلمان متاثر ہوئے کیونکہ "علی گڑھ کے سینکڑوں طالب علموں نے تعلیم ترک کردی' اس کے برعکس ہندو یونیورسٹی بنارس کے طالب علموں اور استادوں پر گاندھی کی اپیلوں اور تلقین کا کوئی اثر نہ ہوا۔(۸۴) اور بقول چودھری محمد علی "بنارس کی ہندو یونیورسٹی جس کا نگران سناتن دھرمی ہندو لیڈر پنڈت مالویہ تھا' ایسی آزمائشوں سے دوچار نہ ہوئی۔"(۸۵)

جب ۱۹۲۰ء میں معاہدہ ساورے کی شرمناک شرائط کا اعلان ہوا تو پورے برصغیر کے مسلمان بے حد رنجیدہ ہوئے۔ خلافت وفد ۱۹ جنوری ۱۹۲۰ء کو وائسرائے سے اپنی بات چیت سے مایوس ہو کر براہ راست برطانوی حکام سے بات چیت کے لئے لندن

پہنچا اور جب انہوں نے انگلستان کے وزیراعظم لائیڈ جارج سے ملاقات میں ترکوں سے انصاف کرنے کو کہا تو انہوں نے رعونت سے کہا "آج آسٹریا کے ساتھ انصاف ہو چکا ہے، جرمنی کو بھی انصاف مل چکا ہے۔ خوب خوفناک انصاف۔۔۔۔۔ ترکی اس انصاف سے کیسے بچ سکتا ہے۔" (۸۶) ادھر گاندھی کی قیادت میں عدم تعاون کی تحریک جاری تھی کہ ۵ فروری ۱۹۲۲ء کو یوپی کے ضلع گورکھپور کے ایک گاؤں چورا چوری میں مشتعل لوگوں نے اکیس کانسٹیبلوں اور ایک پولیس انسپکٹر کو پولیس تھانے میں زندہ جلا دیا، جہاں گولیاں ختم ہونے کے بعد وہ محصور ہو گئے تھے۔۔۔۔۔ گاندھی نے فوراً اپنی تحریک کے ختم کرنے کا اعلان کیا اور حکومت نے انہیں گرفتار کر لیا۔ اس سے پہلے علی برادران بھی جیل میں تھے۔۔۔۔۔ اس سے غیر یقینی صورت حال پیدا ہو گئی۔ اس سے دو برس پہلے مسلمانوں کو علماء کے ایک عاجلانہ فیصلے نے بے پناہ اذیتوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ چون (۵۴) علماء نے فتویٰ جاری کیا کہ ہندوستان اب دارالحرب ہے، اس لئے انہیں افغانستان (دارالامان) کی جانب ہجرت کر جانا چاہئے۔۔۔ بہت سے مسلمان اپنے افراد خانہ اور گھر بار کو لے کر افغانستان کی جانب چل پڑے، جہاں موسم سرما اور افغان حکام کی سردمہری نے ان کا استقبال کیا۔ تحریک کے قائدین اور علمائے اسلام کے اس فیصلے نے سینکڑوں مسلمانوں کو بے پناہ مشکلات سے دوچار کیا اور لاکھوں مسلمانوں کو مایوسی کی حالت میں اسیر کیا۔ رہی سہی کسر جدید ترکیہ کے بانی اتاترک مصطفےٰ کمال پاشا نے پوری کر دی۔ انہوں نے جب اپنی قوت بازو سے انگریزوں کو ۱۹۲۳ء میں ایک بہتر سمجھوتہ معاہدہ لوزین کرنے پر آمادہ کر لیا تو انہوں نے ترکیہ کو سیکولر جمہوریہ قرار دے دیا اور جب سر آغا خاں اور سید امیر علی کا احتجاجی خط اخبارات میں پہلے شائع ہوا اور وزیراعظم عصمت انونو کے پاس بعد میں پہنچا تو ۲ مارچ ۱۹۲۴ء کو خلافت کے ادارے کی تنسیخ کا اعلان کر دیا گیا۔ (۸۷)

بلاشبہ تحریک خلافت بادی النظر میں ناکام ہوئی، مسلمانوں میں بے یقینی اور افسردگی پیدا ہوئی، تحریک میں چندے کے استعمال کے سلسلے میں غلط فہمیاں، بہتان تراشیوں میں تبدیل ہوئیں، مگر مجموعی طور پر ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کو برطانوی استعمار کے خلاف نفرت کے اظہار کا بھرپور موقع ملا۔ عوامی رابطے کی صورت بھی پیدا ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ آزادی کا سفر تیز تر ہو گیا۔۔۔۔۔

(ن) ۱۹۳۰ء تک کی سیاسی و سماجی صورت حال

جوں جوں جدوجہد آزادی تیز ہو رہی تھی، ویسے ویسے ہندومت کے احیاء کی تحریکیں (برھمو سماج، شدھی، سنگھٹن) زور پکڑ رہی تھیں اور مسلمانوں میں مذہبی اور تہذیبی بنیادوں پر اپنی انفرادی شناخت منوانے کی آرزو پروان چڑھ رہی تھی۔ تعلیم بعض سماجی تعصبات اور بندھنوں کے خاتمے کے باوجود دونوں قوموں میں معاشی مسابقت پیدا کر رہی تھی۔ نئے نئے خواب اور ان کی سنسنی خیز تعبیریں جاگنے لگی تھیں۔ ذات پات، چھوت چھات، غربت، جہالت اور افلاس کے عفریت کے روبرو سر جھکائے رکھنا رضائے الٰہی کے مترادف نہیں رہا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دیہاتوں کے جنگل میں بھی سیاسی و سماجی شعور کی شعاعیں پہنچنے لگی تھیں اور "مرد کے پیر کی جوتی" اور "ناقص العقل" مخلوق بھی مردوں کے شانہ بشانہ قومی و سماجی اصلاح کے پروگراموں اور تحریکوں میں شرکت کرنے لگی تھی۔۔۔۔۔۔ برطانیہ نے نوشتہ دیوار پڑھ لیا تھا، اس لئے اس نے مقامی باشندوں کے دل بہلانے کے لئے آئینی اصلاحات کا ایک خوشنما جال بننا شروع کیا۔ سائمن کمیشن فروری مارچ ۱۹۲۸ء اور پھر اکتوبر ۱۹۲۸ء سے لے کر اپریل ۱۹۲۹ء تک ہندوستان میں مقیم رہا۔(۸۸) اس کمیشن کے تمام ارکان چونکہ بدیسی تھے، اس لئے کانگریس نے اس کے مقاصد کا اعلان کیا۔ مسلم لیگ کے اس دھڑے نے بھی کانگریس کا ساتھ دیا، جس کے رہنما قائداعظم تھے۔ البتہ سر شفیع کی مسلم لیگ اور بعض دوسری جماعتوں نے کمیشن کے ساتھ تعاون کیا۔ ہندوستان بھر میں کمیشن کا استقبال مشتعل عوام نے سیاہ جھنڈیوں سے کیا۔ کمیشن کی رپورٹ مئی ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔(۸۹) رپورٹ میں ہندوستان کے لئے وحدانی طرز حکومت کی بجائے وفاقی طرز حکومت کی سفارش کی گئی۔ صوبائی حکومتوں کے اختیارات میں اضافہ بھی تجویز کیا گیا۔ کانگریس نے ۱۹۳۰ء میں اس رپورٹ پر مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے سول نافرمانی کی تحریک شروع کردی، جو بلاشبہ بہت زور دار عوامی تحریک ثابت ہوئی۔ مسلمان رہنماؤں نے عام طور پر اپنی رائے اور قوت محفوظ رکھی۔۔۔۔۔۔ اس سے پہلے موتی لال نہرو کی قیادت میں ایک کمیٹی نے ہندوستان کے آئین کے لئے سفارشات مرتب کیں، جنہیں نہرو رپورٹ (اگست ۱۹۲۸) کا

نام ملا۔ یہ کمیٹی بظاہر لارڈ برکن ہیڈ کے اس طعنے کے جواب دینے کے لئے بنی تھی کہ ہندوستانی متحد ہو کر کوئی آئینی سفارش پیش نہیں کر سکتے۔ مگر اس رپورٹ نے ہندو مسلم اتحاد کی رہی سہی امید بھی ختم کر دی، کیونکہ اس میں اکثریت کے اقتدار کلی کا مطالبہ کیا گیا تھا اور مسلمانوں کے لئے جداگانہ حق رائے دہی کے خاتمے کی سفارش کی گئی تھی۔(۹۰) اس کے جواب میں قائداعظم نے معروف چودہ نکات پیش کئے جن میں وفاقی طرز حکومت، صوبائی خودمختاری، ایک مخصوص عرصے کے لئے جداگانہ حق رائے دہی، مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی ایک تہائی نمائندگی، صوبہ سندھ کے قیام، شمال مغربی صوبے کے لئے اصلاحات کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ مگر قائداعظم کو یہ قرارداد مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ دہلی (دسمبر ۱۹۲۹) میں بعض قوم پرست مسلمانوں کے ہنگامے کی وجہ سے پیش کرنے کا موقع نہ ملا اور اجلاس ملتوی کر دیا گیا۔(۹۱)

حوالہ جات

۱۔ "عرب و ہند کے تعلقات" از سید سلیمان ندوی، کراچی۔ ۷۶، ص ۱۲

۲۔ "دکنی کلچر" از نصیر الدین ہاشمی، لاہور۔ ۶۳، ص ۲۵

۳۔ "ہندوستان پس منظر و پیش منظر" از سید محمد تقی، کراچی۔ ۶۸، ص ۳۳

۴۔ "دی برٹش انڈیا" (انگریزی) از کے۔کے۔ عزیز، اسلام آباد۔ ۷۶، ص ۲۵۷

۵۔ ایضاً ص ۲۵۸

۶۔ (بحوالہ) "انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ" از علامہ عبداللہ یوسف علی، کراچی۔ ۶۷، ص ۵۱

۷۔ "دی فال آف دی برٹش ایمپائر" (انگریزی) از کولن کراس، لندن۔ ۶۹، ص ۲۵

۸۔ "دی برٹش آف انڈیا" ص ۱۹۵

۹۔۱۰۔ "انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ" ص ۲۲۴

۱۱۔ ایضاً ص ۲۱۱

۱۲۔ ایضاً ص ۲۸۳

۱۳۔ ایضاً ص ۳۲۳

۱۴۔ "تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت" (جلد دوم) از سید ہاشمی فرید آبادی، کراچی، ص ۴۲۱

۱۵۔ ایضاً ص ۳۲۲

۱۶۔۱۷۔ "انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ" ص ۳۰۴

۱۸۔ ایضاً ص ۲۳۱

۱۹۔ "انڈین مسلمز۔۔اے پولیٹکل ہسٹری" (انگریزی) از رام گوپال' لاہور ۔ ۷۶' ص ۱۷

۲۰۔ "قائداعظم جناح ایک قوم کی سرگزشت" (ترجمہ رئیس احمد جعفری) از جی الانا' لاہور ۔ ۷۶' ص ۶۷

۲۱۔ "ہندی اردو تنازع" از ڈاکٹر فرمان فتح پوری' اسلام آباد ۔ ۷۷' ص ۴۲

۲۲۔ "اے ہسٹری آف پاکستان" (۱۹۴۷۔۱۹۵۸' (انگریزی) از گانکوفسکی اینڈ پولو سکایا' لاہور طبع اول' ص ۱۵

۲۳۔ "حیات جاوید" از الطاف حسین حالی' ص ۱۶۴

۲۴۔ "پاکستان مومنٹ" ہسٹارک ڈاکومنٹس' (انگریزی) از جی الانا' لاہور ۔ ۷۷' ص ۱۷۲

۲۵۔ "ہسٹارک ڈاکومنٹس آف دی مسلم فریڈم مومنٹ" از جمیل الدین' ص ۷

۲۶۔ ایضاً ص ۱۰

۲۷۔ ایضاً ص ۱۰۔۱۱

۲۸۔ ایضاً ص ۱۲

۲۹۔ ایضاً ص ۱۴

۳۰۔ "ہسٹری آف انڈین نیشنل کانگریس" (انگریزی) جلد اول' از سیتارامیا' ص ۸

۳۱۔ "انڈین مسلمز:اے پولیٹکل ہسٹری" ص ۶۰

۳۲۔ "فاؤنڈیشن آف پاکستان" (انگریزی) تعارف شریف الدین پیرزادہ' کراچی ۔ ۶۹' ص ۱۷۔۱۹

۳۳۔ "پاکستان ناگزیر تھا" کراچی یونیورسٹی ۔ ۷۰' ص ۳۲۔۳۳

۳۴۔ "انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ" ص ۳۱۸

۳۵۔ "پاکستان ناگزیر تھا" ص ۷۹

۳۶۔ ایضاً ص ۳۲

۳۷۔ "دی میکنگ آف پاکستان" (انگریزی) از رچرڈ سمنرز۔ لندن ۵۰' ص ۳۹

۳۸۔ "جرنل آف پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی" (شملہ ڈیپوٹیشن) از ایس آر' واسطی۔ ص ۶۳

۳۹۔ "قائداعظم جناح۔ ایک قوم کی سرگزشت" ص ۱۵۶
۴۰۔ "انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ" ص ۱۳۲
۴۱۔ "افتادگان خاک" (ترجمہ سجاد باقر رضوی) از فرانز فینن (پیش لفظ) لاہور۔ طبع اول ص ۵۔۶
۴۲۔ "ہندوستان پس منظر و پیش منظر" ص ۶۹۔۷۰
۴۳۔ "انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ" ص ۱۸۷
۴۴۔ "دی فال آف دی برٹش ایمپائر" ص ۴۴
۴۵۔ "انڈین مسلمز۔ اے پولیٹکل ہسٹری" ص ۹۲
۴۶۔ "پاکستان" (انگریزی) از دمودر پی سنگھل ص ۴۷
۴۷۔ "دی میکنگ آف پاکستان" ص ۲۶
۴۸۔ "دی سٹرگل فار پاکستان" (انگریزی) از آئی۔ اچ۔ قریشی کراچی۔ ۴۷ء ص ۲۸
۴۹۔ "دی میکنگ آف پاکستان" ص ۲۶
۵۰۔ ایضاً ص ۲۷
۵۱۔ "فاؤنڈیشنز آف پاکستان" (انٹروڈکشن) ص ۱۸/۷
۵۲۔ "قائداعظم میری نظر میں" ص ۷
۵۳۔ "انڈیا ڈوائیڈڈ" ص ۱۱۲
۵۴۔ "مسلم لیگ" (انگریزی) ص ۳۳
۵۵۔ "انڈین مسلمز۔ اے پولیٹکل ہسٹری" ص ۹۷
۵۶۔ "پاکستان" ص ۴۸
۵۷۔ "اے ہسٹری آف پاکستان" ص ۲۹
۵۸۔ "فاؤنڈیشنز آف پاکستان" (انٹروڈکشن) ص ۳۸ (xxxviii)
۵۹۔ "انڈین مسلمز۔ اے پولیٹکل ہسٹری" ص ۹۸
۶۰۔ "فاؤنڈیشنز آف پاکستان" (انٹروڈکشن) ص ۱۳ (xiii)
۶۱۔ "انڈین مسلمز۔ اے پولیٹکل ہسٹری" ص ۱۰۱
۶۲۔ "فاؤنڈیشنز آف پاکستان" ص ۶
۶۳۔ ایضاً ص ۱۶
۶۴۔ ایضاً ص ۲۲

۶۵۔ ایضاً ص ۸۶-۸۱

۶۶۔ "دی میکنگ آف پاکستان" ص ۴۴

۶۷۔ "تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت" (جلد دوم) ص ۵۲۷

۶۸۔ "دی سٹرگل فار پاکستان" ص ۳۴

۶۹۔ "فاؤنڈیشنز آف پاکستان" ص ۲۵۸-۲۵۹

۷۰۔ ایضاً ص ۲۵۵

۷۱۔ "قائداعظم جناح۔ ایک قوم کی سرگزشت" ص ۱۳۲

۷۲۔ "دی وائسرائز جرنل" (انگریزی) مرتبہ پینڈرل مون لندن۔ ۷۴ ص ۳۴۱

۷۳۔ "فریڈم ایٹ مڈنائٹ" (انگریزی) از لیری کولنز اور ڈومینیک لیپرے، ص ۶۴-۶۵

۷۴۔ "نہرو دور کی یادیں" از ایم۔ او متھائی، ص ۳۷

۷۵۔ "پاکستان موومنٹ" ہسٹارک ڈاکومنٹس، ص ۵۱-۵۲

۷۶۔ "پاکستان" (انگریزی) ص ۵۲

۷۸۔ "قائداعظم جناح ایک قوم کی سرگزشت" ص ۱۷۸

۷۹۔ "دی فال آف برٹش ایمپائر" ص ۶۷

۸۰۔ "محمد علی جناح" اے پولیٹکل سٹڈی، (انگریزی) از ایم ایم سید، ص ۸۴

۸۱۔ "ظہور پاکستان" از چودھری محمد علی (ترجمہ بشیر احمد ارشد) لاہور، طبع اول، ص ۲۹

۸۲۔ "تحدیث نعمت" از سر ظفر اللہ، ڈھاکہ۔ ۷۱، ص ۱۸۱

۸۳۔ "انڈین مسلمز" ص ۱۳۷

۸۴۔ "قائداعظم محمد علی جناح، ایک قوم کی سرگزشت" ص ۱۹۱

۸۵۔ "ظہور پاکستان" ص

۸۶۔ "دی سٹرگل فار پاکستان" ص ۴۰

۸۷۔ "پاکستان ناگزیر تھا" ص ۱۳۲

۸۸۔ "دی سٹرگل فار پاکستان" ص ۵۶

۸۹۔ ایضاً ص ۵۶

۹۰۔ "دی میکنگ آف پاکستان" ص ۴۲

۹۱۔ "ہسٹارک ڈاکومنٹس آف دی مسلم فریڈم موومنٹ" ص ۱۰۰

باب دوم

علامہ اقبال اور برصغیر کی عملی سیاست

الف) اقبال کا سیاسی شعور، عملی جدوجہد اور اثرات

ب) اقبال، ایوان اسمبلی میں

ج) پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کے خلاف اقبال کی مزاحمت

الف) اقبال کا سیاسی شعور عملی جدوجہد اور اثرات

خاص و عام سے اقبال کا پہلا تعارف شاعر کے طور پر ہوا' انجمن حمایت اسلام کے پلیٹ فارم سے پیش کی گئی نظموں "نالہ یتیم" ، "یتیم کا خطاب ہلال عید سے" "برگِ گوہر بار" اور وطن پرستی میں ڈوبی ہوئی نظموں "ہمالہ" ، "ترانہ ہندی" ، "ہندوستانی بچوں کا گیت" اور "نیا شوالہ" کی اشاعت نے انہیں پرجوش ہندوستانی شاعر کے طور پر مقبول بنا دیا۔ ۱۹۰۵ء میں وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان گئے تو ان میں دو بنیادی تبدیلیاں آئیں' ایک تو وہ خالص شاعری' کے قائل نہ رہے اور دوسرے انہوں نے وطن کی بجائے ملت کو اپنا موضوع بنایا اور فارسی زبان کو اپنے تخلیقی اظہار کا وسیلہ بنایا۔ قیام انگلستان کے زمانے میں ہی وہ برٹش کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ کے رکن بن گئے' جس کے قائد سید امیر علی تھے۔(۱) جب وہ وطن واپس آئے تو صوبائی مسلم لیگ کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔ اس کے صدر شاہ دین' سیکرٹری سر شفیع اور اسسٹنٹ سیکرٹری اقبال کے ایک دوست جلال الدین بیرسٹر تھے' چنانچہ وہ اس کے رکن ہو گئے۔(۲) تاہم سیاسی محاذ پر کبھی کبھار اخباری بیان کے علاوہ اقبال کی نمائندگی نہیں تھی' ان کی پذیرائی مسلمانان برصغیر کی آزادی اور نشاۃ الثانیہ کا خواب دیکھنے والوں میں ہونے لگی۔ وہ وکالت کرتے تھے' تدریس سے بھی وابستہ تھے اور پبلک اجلاسوں کی صدارت بھی کرتے تھے۔ دوستوں کے نام مکتوبات میں ہندوستانی سیاست اور عالمی سیاسیات پر تبصرہ بھی کرتے تھے' مگر ۱۹۲۶ء تک وہ عملی سیاست سے کسی قدر بے تعلق رہے۔ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴-۱۹۱۸) کے دوران انہیں اگر کسی نیم سیاسی اجلاس کی صدارت کی دعوت بھی آئی تو غالباً مصلحت کے تحت انہوں نے اس سے معذرت کرلی' تاہم تحریک خلافت سے انہیں دلی وابستگی رہی۔ چنانچہ وہ خلافت کمیٹی پنجاب کے سیکرٹری بھی ہو گئے' مگر جب کانگریس اور خلافت تحریک نے مشترکہ طور پر ترک تعاون کی مہم چلائی' علی گڑھ کی درسگاہ کے مقابل جامعہ ملیہ کی تشکیل کر کے اسلامیہ کالج لاہور کے ٹرسٹیوں' اساتذہ اور طلبہ کے لئے تحریک ترک تعاون میں شرکت کی دعوت لے کر علی برادران لاہور پہنچے تو اقبال نے ان سے اختلاف کیا بلکہ انہیں یہ کہہ کر بدمزہ کیا کہ مسلمان طالب علموں کے لئے فوری طور پر ایک ٹیکنولاجیکل انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جائے۔(۳)

۱۹۲۶ء میں تجاویز دہلی اور پھر ۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کی آمد نے شفیع لیگ کو متحرک کیا' تو علامہ اقبال بھی سیاست میں عملی دلچسپی لینے لگے۔ ۱۹۲۶ء میں وہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن کا انتخاب جیت چکے تھے' وہ لاہور کے فرقہ وارانہ فسادات' راجپال کی اہانت رسول ﷺ کے مقدمے اور مسلمانان برصغیر کے سیاسی حقوق اور تہذیبی شناخت کے تحفظ کے لئے عملاً میدان میں آگئے اور یوں انہیں ایک شاعر اور مفکر کے علاوہ سیاست دان کے طور پر پہچانا جانے لگا۔

دسمبر ۱۹۳۰ء میں انہوں نے بطور صدر مسلم لیگ وہ خطبہ پڑھا جو تصور پاکستان کا پہلا نقش مبین ہے۔ پہلی گول میز کانفرنس میں علامہ اقبال کو شرکت کی دعوت نہ دی گئی' البتہ دوسری اور تیسری کانفرنس میں انہوں نے شرکت کی۔ اگرچہ ان کانفرنسوں میں ان کی شرکت بہت زیادہ فعال رہنما کی نہیں تھی لیکن انہیں برصغیر کے مسلمانوں اور ساتھ ہی ساتھ دنیا بھر کے مسلمانوں کے مسائل کی جانب عالمی رائے عامہ کو متوجہ کرنے کا موقع ضرور ملا۔ وہ انگلستان آتے جاتے مصر اور فلسطین میں بھی رکے۔ فلسطین کے حوالے سے بھی انہیں ملت اسلامیہ کے سیاسی اضطراب کو تحریک کی صورت میں ڈھالنے کا موقع ملا۔ بیت المقدس میں موتمر عالم اسلامی کا اجلاس (۶ دسمبر ۱۹۳۱) ہوا۔ اگلے روز موتمر کے عہدیداروں کا انتخاب عمل میں آیا۔ مفتی اعظم فلسین سید امین الحسینی اتفاق رائے سے صدر اور علامہ اقبال نائب صدر منتخب ہوئے۔(۴) مارچ ۱۹۳۲ء میں وہ کل ہند مسلم کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے (جو سر فضل حسین نے جناح کی نمائندہ حیثیت کو گھٹانے کے لئے تشکیل دی تھی) اور یوں عملی سیاست میں اب وہ مسلمانوں کی صف اول کی قیادت میں شامل ہو گئے' جس کی جماعت یا تنظیم سے زیادہ ان کی شخصیت اور فکر کو مسلمانوں میں پذیرائی حاصل تھی۔ بالآخر تاریخی حالات نے قائداعظم اور علامہ محمد اقبال کو یک جا کر کے برصغیر میں مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کو نتیجہ خیز بنا دیا۔

ب) اقبال ایوان اسمبلی میں

۲۰ جولائی ۱۹۲۶ء کو علامہ اقبال نے پنجاب لیجسلیٹو کونسل کی رکنیت کے لئے امیدوار کی حیثیت سے اعلان کیا :

"مسلمانوں کو معلوم ہے کہ میں اب تک اس قسم کے مشاغل سے

بالکل علیحدہ رہا ـــــــ اور میں نے اپنے لئے دائرہ کار منتخب کر لیا تھا، لیکن اب قوم کی مصیبتیں مجبور کر رہی ہیں کہ میں اپنا حلقہ عمل قدرے وسیع کر لوں۔" (۵)

علامہ اقبال کے ایک دوست اور سابق رکن میاں عبدالعزیز بیرسٹر پہلے ہی ان کے حق میں امیدوار بننے کے ارادے سے ہی دستبردار ہو چکے تھے، جبکہ اقبال کے اعلان اور مہم کے بعد دو اور امیدواروں نے بھی اپنے نام واپس لے لئے، لیکن خان بہادر ملک دین محمد نے نہ صرف مقابلہ کیا بلکہ اسے برادریوں کے مابین دنگل میں تبدیل کرنے کی کوشش کی، مگر اقبال کے پرجوش حامیوں نے شہر کی تمام برادریوں سے ان کی حمایت حاصل کی۔ بہر طور علامہ اقبال کو پانچ سو چھ پچھتر ووٹ ملے اور ان کے مدمقابل کو دو ہزار چھ سو اٹھانوے (۶) اس طرح ۵ دسمبر ۱۹۲۶ء کو وہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن منتخب ہو گئے۔

پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں علامہ اقبال نے لگان، فرقہ وارانہ دلآزار لٹریچر کی بندش، یونانی طریق علاج کی اہمیت مگر دوا سازی کے عمل میں مغرب سے استفادے، جبری تعلیم کی ضرورت، پنجاب میں نجی مدارس کی امداد کے سلسلے میں مسلم مدارس کو نظرانداز کرنے کی روش، انتظامی اخراجات میں تخفیف اور فرقہ وارانہ فضا میں انتظامی افسروں میں بدیسیوں کو ہی اختیار دینے کے متنازعہ مسئلے پر بھی اہم تقاریر کیں۔ انہیں تقاریر کے دوران مخالف پھبتیوں کا سامنا ہوتا تھا مگر وہ حاضر جوابی اور ذہانت کا مظاہرہ کرتے، ہر مسئلے پر دلائل اور علمی نظریات کے حوالے پیش کرتے، جس سے ان کی تقاریر خطابت سے شعلہ بروار ہونے کی بجائے فکر انگیز ہوتیں۔ ان کی مختلف تقاریر کے بعض اقتباسات ملاحظہ کیجئے :

(i) "تدریجی ترقی کے اصول کو لگان میں استعمال نہ کرنے کا جواب بعض اوقات غیر متمدن نظریات میں یہ پایا جاتا ہے کہ زمین حکومت کی ہے ـــــــ یہ امر مسلمہ ہے کہ اس ملک میں بادشاہوں نے اس قسم کے حقوق کا مطالبہ نہیں کیا ـــــــ لگان میں تدریجی ترقی کے اصول کو استعمال کرنا چاہئے۔" (اس کے علاوہ حکومت پنجاب نے نیلی بار ضلع منٹگمری میں سوا تین لاکھ ایکڑ رقبہ زیادہ تر سرمایہ داروں کے ہاتھ فروخت

کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ تحریک پیش کی تھی کہ اس زمین کا نصف حصہ مزارعین کے لئے مخصوص کر دیا جائے۔) (۸)

(ii) "ہندوستان ایک غریب ملک ہے اور یہاں کے باشندے قیمتی دواؤں کا استعمال نہیں کر سکتے۔ اس لئے ایسے نظام کو جو سستا ہو' رواج دینا ضروری ہے۔ اس نکتے کے پیش نظر میرا خیال یہ ہے کہ یونانی اور آیورویدک طبی نظام ہمارے لئے زیادہ مناسب ہیں۔ یہ درست ہے کہ جس طریق پر ہماری دوائیاں تیار کی جاتی ہیں وہ ناقص ہے اور اس میں اصلاح کی ضرورت ہے۔" (۹)

(iii) "رپورٹ میں مذکور ہے کہ لڑکوں کی ایک کثیر تعداد پہلی جماعت میں داخل ہوتی ہے لیکن وہ روپیہ جو ان پر خرچ کیا جاتا ہے' اس لئے ضائع ہوتا ہے کہ یہ لڑکے اعلیٰ جماعتوں تک نہیں پہنچتے۔ اگر ان لوگوں پر ایک کثیر رقم خرچ کی جاتی ہے تو یہ آپ کا فرض ہے کہ ان کو اعلیٰ جماعتوں تک بھی لے جایا جائے۔ انہیں اعلیٰ جماعتوں پر پڑھنے پر مجبور کرنا چاہئے۔ لہٰذا میں گزارش کرتا ہوں کہ جہاں تک ابتدائی تعلیم کا تعلق ہے اس صوبے کی فلاح و بہبود کے پیش نظر جبری طریقہ تعلیم کا اختیار کرنا بے حد ضروری ہے۔" (۱۰)

(iv) "ایسے سکولوں کی تعداد جن کو یہ امداد ملی ۲۱ ہے' اس میں سے ۱۳ ہندو مدرسہ ہیں' ۶ سکھ مدرسے اور صرف ۲ مسلم مدرسے۔ ہندو مدرسوں کو جو امداد ملی ان کا میزان ۱۴٬۹۷۳ روپے ہے۔ سکھ مدرسوں کو ۹٬۹۰۰ کی امداد ملی اور مسلمان مدرسوں کو صرف ۲۲۲۰ روپے کی امداد۔" (۱۱)

(v) "اگر آپ آرام سے زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو موجودہ نظام کا خاتمہ کرنا ضروری ہے' موجودہ طریق نظم و نسق پر ہم دنیا کے تمام ممالک سے زیادہ خرچ کرتے ہیں' کوئی دوسرا ملک نظم و نسق پر اتنا روپیہ خرچ نہیں کرتا۔" (۱۲)

(vi) "بدقسمتی سے میرے دوست پنڈت نانک چند اس وقت یہاں نہیں ہیں' انہوں نے کہا کہ حکومت نے رنگ و نسل کا امتیاز اڑا دیا ہے۔ اس طرح وہ اسامیاں جو پہلے برٹش افسروں کو ملتی تھیں اب ہندو اور مسلمانوں کے حصہ میں آتی ہیں' لیکن میں اپنے دوست کو یقین دلاتا ہوں کہ حکومت نے اس معاملہ میں بڑی سخت غلطی کی ہے اور

اگر برٹش افسروں کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے تو میں اس کا خیر مقدم کروں گا۔ (آوازیں نہیں نہیں) جب میں یہ کہتا ہوں تو اپنی ذمہ داری کو پوری طرح محسوس کر کے کہتا ہوں اور میں "نہیں، نہیں" کی آواز کا مطلب بھی خوب سمجھتا ہوں۔ میں اس غلط اور سطحی قومیت سے مسحور نہیں ہوں، جس کا اظہار اس طریق پر کیا جائے۔ (ڈاکٹر شیخ محمد عالم۔ ہر شخص ایسا نہیں ہے) خیر ممکن ہے ایسا ہو لیکن متحدہ قومیت کی گفتگو بیکار ہے اور بہت عرصہ تک بیکار ہی رہے گی۔ یہ لفظ پچھلے پچاس سال سے زبان زد عام رہا ہے، لیکن جس طرح زیادہ کڑکڑ کرنے والی مرغی انڈہ نہیں دیتی، اسی طرح اس لفظ سے بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا۔" (۱۳)

علامہ اقبال کی موخرالذکر تقریر کو ٹائمز (لندن) کے نامہ نگار شملہ نے خوب اچھالا۔ نامور مسلمان رہنما مولانا محمد علی جوہر کو جو ان دنوں لندن میں تھے، ٹائمز ہی کے ذریعے اس کا علم ہوا۔ انہوں نے طنزیہ اسلوب میں اقبال کے اس موقف پر گرفت کی۔ ان کے روزنامہ "ہمدرد" کی ۱۹۲۷ء کے ماہ اگست ۱۶، ۱۷، ۱۹ اور ۲۷ کی اشاعت میں پانچ اقساط کی صورت میں ان کا ردعمل شائع ہوا۔ جس کی تلخیص عتیق صدیقی نے اپنی کتاب اقبال جادوگر ہندی نژا میں شامل کی ہے۔

علامہ اقبال نے اسمبلی میں انسداد شراب نوشی اور تلوار کو قانون اسلحہ سے مستثنیٰ رکھنے کی تحریکیں بھی پیش کی تھیں۔ (۱۴) اس کے علاوہ اقبال نے اسمبلی میں یہ تحریک بھی پیش کی کہ مذہبی پیشواؤں اور بزرگوں پر جو کینہ پرور اور اہانت آمیز حملے لئے جاتے ہیں ان کے انسداد کے لئے ایک قانون نافذ کیا جائے، چنانچہ یہ قانون ۱۹۲۷ء میں نافذ ہو گیا۔ (۱۵)

ج) پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کے خلاف علامہ اقبال کی مزاحمت

یونینسٹ پارٹی پنجاب کے ایک شاطر سیاست دان سر فضل حسین کے خلاق ذہن کی پیداوار تھی، سر فضل حسین، انگریز ارباب اختیار کو بہت عزیز تھے، وہ ایک طرف کل ہند مسلم سیاست میں اس کردار کے ذمہ دار تھے، جس کے طفیل مسلم لیگ دو حصوں میں تقسیم ہو کر جناح لیگ اور شفیع لیگ کہلائی۔ (موخرالذکر کے سیکرٹری علامہ اقبال رہے اور دھڑے کے پیشوا سر فضل حسین تھے) دوسری طرف مسلمانان پنجاب میں مقبولیت

حاصل کرنے کے لئے اپنی حکام رسی کے باعث کئی اقدامات کر چکے تھے' (گورنمنٹ اور میڈیکل کالج میں چالیس فیصد مسلمان داخل کئے جائیں گے اور یہی پاسنگ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے لئے ہو گا) اور اس کے ساتھ ساتھ اس سر فضل حسین نے جس نے دسمبر ۱۹۱۹ء میں نہرو کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے سر مائیکل ایڈوائر کی پالیسی پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا تھا کہ اس نے پنجاب میں دیہاتی اور شہری کی تفریق پیدا کر کے صوبے کی سیاسی ترقی میں رکاوٹ ڈال دی تھی اور ۱۹۲۰ء میں چودھری لال چند کی تجاویز کی محض اس لئے مخالفت کی تھی کہ ان تجویزوں پر عمل کرنے سے صوبے کی تعلیم یافتہ آبادی پر دیہاتیوں کا ناروا تفوق قائم ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ جنوری ۱۹۲۴ء میں پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی میں اکثریت کے حصول کے لئے چودھری لال چند اور اس کے ساتھیوں سے اتحاد کر کے نیشنل یونینسٹ پارٹی قائم کی' جو ۱۹ اپریل ۳۶ میں پنجاب یونینسٹ پارٹی کے طور پر منظم ہوئی' جس کا منشور ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے اپنی کتاب "اقبال کے آخری دو سال" کے صفحات ۷۰۸ تا ۷۲۹ میں درج کیا ہے :

> "اس جماعت کی تشکیل سے پنجاب کے مسلمان جاگیرداروں اور پیروں کا سیاسی اتحاد دیہاتی ہندوؤں اور اکالیوں سے قائم ہو گیا' جس سے ایک طرف تو موقعہ پرست سیاست کو فروغ ملا' دوسری طرف پنجاب کی سیاست میں شہری اور دیہی تفریق پیدا ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ ذات' برادری کے حوالے سے بھی وہ جتھ بندی وجود میں آئی اور یوں وہ ہتھ کنڈہ سامنے آیا جسے قیام پاکستان کے بعد بھی طالع آزما استعمال کرتے رہے۔"

سر فضل حسین اور علامہ اقبال کالج میں ہم جماعت رہ چکے تھے' اقبال نے بانگ درا کی ایک یادگار نظم فلسفہ غم' فضل حسین کے نام معنون کی تھی' اسی طرح اقبال فضل حسین کی قائم کی ہوئی مسلم کانفرنس کے بڑے سرگرم رکن تھے' اسی طرح اقبال کو فضل حسین نے ہی ستمبر ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس کا مندوب بنا کر انگلستان بھیجا تھا' اس کے باوجود چند برسوں میں ہی علامہ اقبال اور سر فضل حسین اور بالخصوص یونینسٹ پارٹی میں بے پناہ فاصلہ پیدا ہو گیا۔ ۱۹۳۵ء میں جب سر فضل حسین وائسرائے

کی ایگزیکٹو کونسل سے سبکدوش ہو کر لاہور آئے اور پنجاب کی سیاسی صورت حال پر ایک افسردہ تبصرہ کیا تو علامہ اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے سر فضل حسین کو یاد دلایا :

"یہ کس قدر افسوسناک امر ہے کہ پنجاب میں شہری' دیہاتی کا جو جھگڑا چل رہا ہے اسے سر فضل حسین کی امداد حاصل ہے۔ فضل حسین کو ابتداء میں قیادت کا منصب اس لئے حاصل نہیں ہوا تھا کہ وہ دیہاتی تھے' بلکہ اس لئے کہ وہ صوبے کے مسلمانوں کے لیڈر تھے' لیکن انہوں نے قیادت حاصل کرنے کے بعد جان بوجھ کر شہری' دیہاتی جھگڑے کو تیز کرنا شروع کر دیا' تاکہ اس طرح ان کا منصب بحال رہے۔ اس جھگڑے سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے بعض ایسے ناکارہ اور تیسرے درجے کے آدمیوں کو اپنا رفیق منتخب کیا جو حکومت کے قطعاً اہل نہ تھے۔۔۔۔۔۔ مسلمانوں میں صحیح لیڈر شپ مفقود ہو چکی ہے اور سیاسی میدان چند حد درجہ نالائق مقدر آزماؤں کے قبضے میں چلا گیا ہے۔"(۱۷)

اس سے ایک برس پہلے جب پنجاب کے گورنر سر ہربرٹ ایمرسن نے انجمن حمایت اسلام کے اجلاس میں مسلمانوں کے باہمی نفاق اور قیادت کے فقدان پر اظہار افسوس کیا تھا تو اقبال نے اپنے ایک بیان میں انہیں بھی یاد دلایا تھا :

"سر ہربرٹ ایمرسن نے تو مسلمانوں میں حقیقی لیڈر شپ کے فقدان پر اظہار افسوس کیا ہے' میں اس کے برعکس اس بات پر افسوس کا اظہار کرتا ہوں کہ حکومت نے جان بوجھ کر ایسا طرز عمل اور پالیسی اختیار کر رکھی ہے جس نے اس صوبے میں اصلی اور پائیدار لیڈر شپ کے پیدا ہونے کی تمام امیدوں کا قلع قمع کر دیا ہے۔"(۱۸)

۱۹۳۶ء۔۱۹۳۷ء کے انتخابات سے پہلے قائداعظم نے کوشش کی تھی کہ انہیں پنجاب میں سر فضل حسین کا تعاون مل جائے' مگر اس سلسلے میں ناکامی کے بعد وہ اقبال سے ملے اور یوں زندگی کے آخری دو برسوں میں علامہ اقبال نے پنجاب کی سیاست میں

یونینسٹوں کے خلاف بھرپور مزاحمت کی۔ صوبائی اسمبلی میں بھی وہ یونینسٹوں پر تنقید کرتے رہے تھے' جس کے باعث سر شہاب الدین کی سبکدوشی کے بعد جب علامہ اقبال کے نام کو کونسل کی صدارت کے لئے زیر غور لایا گیا تو یونینسٹوں نے ان کی مخالفت کی۔(۱۹)

۹ جولائی ۳۶ کو سر فضل حسین کا انتقال ہوا تو سر سکندر حیات ان کے سیاسی جانشین بنے' جو اپنی دو عملی کے باعث مسلم لیگ کے ساتھ بھی روابط رکھتے تھے' چنانچہ ان کے بعض ساتھی میر احمد یار خاں دولتانہ' راجہ غضنفر علی اور نواب افتخار حسین ممدوٹ وغیرہ لیگ کے اجلاس میں بھی شرکت کرتے تھے اور بعض اوقات عہدے بھی قبول کر لیتے تھے (سر فضل حسین پر دباؤ ڈالنے کے لئے اور پنجاب کے مسلمانوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے) مگر وقت آنے پر اپنے اس نصب العین کو ظاہر کر دیتے تھے کہ پنجاب میں مسلم لیگ اپنے تشخص کو یونینسٹوں میں گم کر دے۔۔۔۔۔۔ ان انتخابات سے پہلے ہی مسلمانان برصغیر اور مسلم لیگ کو کئی صدمے برداشت کرنے پڑے۔ دو دیگر ارکان نواب چھتاری اور سر محمد یوسف نے بورڈ سے مستعفی ہو کر نیشنل ایگریکلچرل پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا۔(۲۰) بہار سے سید حسین امام اور سید عبدالعزیز نے پارلیمانی بورڈ سے استعفی دے دیا۔ بنگال میں مولوی فضل الحق کے طرز عمل کے باعث انہیں پارلیمانی بورڈ سے خارج کرنا پڑا اور دوسرے مسلم اکثریتی صوبے پنجاب میں مسلم لیگ کے صرف سات امیدواروں نے انتخاب میں حصہ لیا' جس میں محض دو امیدوار منتخب ہوئے۔ ملک برکت علی اور راجہ غضنفر علی خاں۔ ان میں سے موخرالذکر جیتنے کے فوراً بعد مسلم لیگ کو چھوڑ کر یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے جو اصل میں اقتدار پارٹی تھی۔ ۱۵۔۱۶ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ہوا۔ اسی اجلاس میں سکندر جناح پیکٹ ہوا جس پر علامہ اقبال افسردہ ہوئے' انہیں یقین تھا کہ موقع پرست سر سکندر حیات اور مسلم لیگ کا سیاسی راستہ ایک نہیں ہو سکتا۔ (ملاحظہ کیجئے علامہ اقبال کے خطوط جناح کے نام) بعد کے حالات نے اقبال کے خدشات کی تصدیق کر دی۔ ۱۹۴۴ء میں اس پیکٹ کے خاتمے کا اعلان ہوا اور ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ اور یونیسٹوں میں براہ راست مقابلہ ہوا اور پھر یونینسٹ حکومت کے خلاف مسلم لیگ کی سول نافرمانی تحریک سے بالآخر مسلمانانِ پنجاب کی نمائندگی کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے

جاگیردار اور پیر صاحبان (وقتی طور پر) پسپا ہو گئے۔

اپنی شاعری کے آخری دور میں اقبال نے پنجابی مسلمان کی حالت اور فطرت کا تجزیہ تاریخی و نفسیاتی شعور سے کیا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے نام اقبال ایک مکتوب میں پنجاب کی اہمیت (مستقبل کے سیاسی اور تہذیبی کردار) پر روشنی ڈالتے ہیں :

> "مسلمانوں کو اپنے تحفظ کے لئے جو لڑائیاں آئندہ لڑنا پڑیں گی' ان کا میدان پنجاب ہو گا۔ پنجابیوں کو اس میں بڑی بڑی دقتیں پیش آئیں گی' کیونکہ اسلامی زمانے میں یہاں کے مسلمانوں کی مناسب تربیت نہیں کی گئی' مگر اس کا کیا علاج کہ آئندہ رزم گاہ یہی سرزمین معلوم ہوتی ہے۔" (۲۱)

پنجاب کے پیروں' مخدوموں اور گدی نشینوں کو بال جبریل کی انقلاب آفریں نظم "باغی مرید" میں اس طرح بے نقاب کیا ہے :

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
شہری ہو' دیہاتی ہو مسلمان ہے سادہ
مانند بتاں بجتے ہیں کعبے کے برہمن
نذرانہ نہیں سود ہے پیران حرم کا
ہر خرقہ سالوس کے اندر ہے مہاجن
میراث میں آتی ہے انہیں مسند ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

حوالہ جات

۱۔ "اقبال کا سیاسی کارنامہ" ص ۳۲

۲۔ ایضاً ص ۵۰

۳۔ "مضامین محمد علی" (حصہ دوم) مرتبہ محمد سرور' دہلی ۴۰ ۔ ص ۴۲۶

۴۔ "سفرنامہ اقبال" از محمد حمزہ فاروقی کراچی ۷۳' ص ۱۲۶

۵۔ "گفتار اقبال" مرتبہ رفیق افضل، لاہور ۶۹ ص ۱۴
۶۔ "روزگار فقیر" (جلد اول) از فقیر وحید الدین کراچی ۹۰، ص ۱۰۳
۷۔ "حرف اقبال" مرتبہ لطیف احمد شروانی، ص ۸۰۔۸۱
۸۔ "اقبال کا سیاسی کارنامہ" ص ۱۴۵
۹۔ "حرف اقبال" ص ۹۲
۱۰۔ ایضاً ص ۸۴
۱۱۔ ایضاً ص ۱۰۹
۱۲۔ ایضاً ص ۱۰۷
۱۳۔ ایضاً ص ۸۹۔۹۰
۱۴۔۱۵ "اقبال کا سیاسی کارنامہ" ص ۱۴۵
۱۶۔ "اقبال کے آخری دو سال" ص ۱۸۹
۱۷۔ ایضاً ص ۲۷۶۔۲۷۷
۱۸۔ ایضاً ص ۲۷۹
۱۹۔ فضل حسین۔ اے پولیٹکل بائیو گرافی (انگریزی) از عظیم حسین، بمبئی ۲۵ ص ۳۱۹
۲۰۔ "اقبال کے آخری دو سال" ص ۳۶۶
۲۱۔ "اقبال نامہ" (جلد دوم) مرتب شیخ عطاء اللہ لاہور ۵۱۔ لاہور ۷۸

باب سوم

اقبال اور تصور پاکستان

الف) علامہ اقبال کا خطبہ الہ آباد

ب) تصور پاکستان کے سیاسی اور فکری خدوخال

ج) رد عمل، کثرت تعبیر

د) دیگر تجاویز پاکستان

الف) علامہ اقبال کا خطبہ الہ آباد

۱۹۳۰ء کا سال برصغیر کی سیاسی تاریخ میں کئی اعتبار سے اہم ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح اپنوں اور غیروں کے رویے سے دل برداشتہ ہو کر خود اختیاری جلاوطنی کے عالم میں لندن میں تھے (۱۹۳۰ تا ۱۹۳۴)۔ سائمن کمیشن رپورٹ شائع ہو چکی تھی اور کانگریس اس کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز کر چکی تھی۔ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے پر تشدد لائحہ عمل کو نوجوانوں میں مقبول بنانا شروع کر دیا تھا۔ پہلی گول میز کانفرنس ہندوستان کے دستوری نظام کا متفقہ خاکہ تشکیل دینے میں عملاً ناکام رہی تھی۔ اس ماحول میں علامہ محمد اقبال آل انڈیا مسلم لیگ کے اکیسویں اجلاس کے صدر منتخب ہوئے، جو ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو الہ آباد میں ہوا۔۔۔۔ جہاں علامہ اقبال کا خطبہ صدارت تحریک پاکستان کا ایک اہم اور روشن باب ہے۔

علامہ اقبال نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا :

"میں کسی جماعت کا رہنما نہیں اور نہ کسی رہنما کا پیرو ہوں، میں نے اپنی زندگی کا زائد حصہ اسلام اور اسلامی فقہ و سیاست، تہذیب و تمدن اور ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس مسلسل اور متواتر تعلق کی بدولت جو مجھے تعلیمات اسلامی کی روح سے جیسا کہ مختلف زبانوں میں اس کا اظہار ہوا ہے، رہا ہے، میں نے اس امر کے متعلق ایک خاص بصیرت پیدا کر لی ہے کہ ایک عالم گیر حقیقت کے اعتبار سے اسلام کی حیثیت کیا ہے، لہٰذا یہ فرض کرتے ہوئے کہ مسلمانان ہندوستان بہرحال اپنی اسلامی روح کو برقرار رکھنے پر مصر ہیں، میں کوشش کروں گا کہ آپ کے فیصلوں کی رہنمائی کی بجائے اسی بصیرت کی روشنی میں خواہ اس کی قدروقیمت کچھ بھی ہو، آپ کے دل میں اس بنیادی اصول کا احساس پیدا کر دوں جس پر میری رائے میں ہمارے تمام فیصلوں کا عام انحصار ہونا چاہئے۔" (۱)

اس کے بعد انہوں نے اسلام اور قومیت کے ذیلی عنوان سے جو نقطہ نظر

پیش کیا وہ فلسفیانہ اور اخلاقی زیادہ ہے اور سیاسی کم، انہوں نے کہا :

"دنیا بھر میں شاید ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں اسلام کی وحدت خیز قوت کا بہترین اظہار ہوا ہے۔ دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی جماعت اسلامی کی ترکیب صرف اسلام ہی کی رہین منت ہے، کیونکہ اسلامی تمدن کے اندر ایک مخصوص اخلاقی روح کارفرما ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کا اندرونی اتحاد اور ان کی نمایاں یکسانیت ان قوانین و ادارات کی شرمندہ احسان ہے جو تہذیب اسلامی سے وابستہ ہیں۔۔۔۔۔ مذہب اسلام کی رو سے خدا اور کائنات، کلیسا اور ریاست اور روح اور مادہ ایک ہی کل کے مختلف اجزاء ہیں۔۔۔۔۔ اسلام کے نزدیک مادہ روح کی اس شکل کا نام ہے جس کا اظہار قید مکانی و زمانی میں ہوتا ہے۔" (۲)

اس ضمن میں وہ مزید کہتے ہیں :

"آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لئے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو اس امر سے مایوس نہیں ہو گیا ہے کہ اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے جو ذہن انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کر سکتی ہے، جس کا یہ عقیدہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور جسے یقین ہے کہ اسے کسی دوسری تقدیر کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔۔۔۔۔ میرے نزدیک یہی ایک صورت ہے اس امر کی کہ میں آپ کی سیاسی راہوں کو اپنے عقائد کی روشنی میں منور کر سکوں۔" (۳)

اس کے بعد وہ "قومیت ہند کا اتحاد" کے ذیلی عنوان سے کہتے ہیں :

"میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحے کے لئے بھی کسی ایسے نظام سیاست پر غور کرنے کے لئے آمادہ ہو گا جو کسی ایسے وطنی یا قومی اصول پر جو اسلام کے اصول اتحاد کی نفی کرے، مبنی ہو۔ مشہور فرانسیسی عالم رینان (Renan) کا قول ہے کہ انسان نہ نسل کی قید گوارا کر سکتا ہے، نہ مذہب کی، نہ دریاؤں کا بہاؤ اس کی راہ میں

حائل ہو سکتا ہے نہ پہاڑوں کی سمتیں اس کے دائرے کو محدود کر سکتی ہیں۔ اگر صحیح الدماغ انسانوں کا ایک زبردست اجتماع موجود ہے اور ان کے دلوں میں جذبات کی گرمی ہے تو انہی کے اندر وہ اخلاقی شعور پیدا ہو جائے گا جسے ہم لفظ "قوم" سے تعبیر کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔ لیکن تجربہ بتلاتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف مذاہب اور متعدد جاتیوں میں اس قسم کا کوئی رجحان موجود نہیں کہ وہ اپنی انفرادی حیثیت کو ترک کر کے ایک وسیع جماعت کی صورت اختیار کر لیں۔ ہر گروہ اور ہر مجموعہ مضطرب ہے کہ اس کی ہیئت اجتماعیہ قائم رہے۔ لہٰذا اس قسم کا اخلاقی شعور جو ریناں کے لئے کسی قوم کی تخلیق کے لئے ناگزیر ہے' ایک ایسی عظیم قربانی کا طالب ہے جس کے لئے ہندوستان کی کوئی جماعت تیار نہیں ہے۔" (۴)

علامہ اقبال اس کے بعد ہند میں موجود مختلف اقوام کے باہمی عناد اور شکوک کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں :

"جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے' مجھے یہ اعلان کرنے میں مطلق تامل نہیں' اگر فرقہ وارانہ امور کے ایک مستقل اور پائیدار تصفیے کے لئے اس بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانان ہندوستان کو اپنی روایات و تمدن کے ماتحت اس ملک میں آزادانہ نشو و نما کا حق حاصل ہے تو وہ اپنے وطن کی آزادی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔۔۔۔۔۔ وہ فرقہ داری جو دوسری قوموں سے نفرت اور ان کی بدخواہی کی تعلیم دے' اس کے ذلیل اور ادنیٰ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ میں دوسری قوموں کے رسوم و قوانین اور ان کے معاشرتی اور مذہبی ادارات کی دل سے عزت کرتا ہوں بلکہ بحیثیت مسلمان میرا یہ فرض ہے کہ اگر ضرورت پیش آئے تو احکام قرآنی کے حسب اقتضاء میں ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کروں' بایں ہمہ مجھے اس جماعت سے دلی محبت ہے جو میرے اوضاع واطوار اور میری زندگی کا سرچشمہ ہے اور جس نے اپنے دین اور اپنے ادب' اپنی حکمت اور اپنے تمدن سے بہرہ مند کر کے مجھے وہ کچھ عطا کیا' جس سے میری زندگی کی تشکیل ہوئی۔ یہ اسی کی برکت ہے کہ میرے ماضی نے از سر نو زندہ ہو کر مجھ میں یہ احساس پیدا کر دیا ہے کہ وہ آپ بھی میری ذات میں سرگرم کار ہے۔" (۵)

اس کے بعد اقبال اپنے خطبے کے مرکزی نکتے بعنوان "ہندوستان کے اندر

ایک اسلامی ہندوستان" کی طرف آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں :

"لہٰذا ثابت ہوا کہ ہندوستان میں ایک متوازن اور ہم آہنگ قوم کی نشوونما کے لئے مختلف ملتوں کا وجود ناگزیر ہے۔۔۔۔۔ یہ امر کسی طرح بھی مناسب نہیں کہ مختلف ملتوں کے وجود کا خیال کئے بغیر ہندوستان میں مغربی اصول جمہوریت پر عمل کرنا شروع کر دیا جائے۔ مسلمانوں کا یہ مطالبہ بالکل بجا ہے کہ وہ ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان قائم کریں۔۔۔۔۔ میری رائے میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قراردادوں سے اسی بلند نصب العین کا اظہار ہوتا ہے۔۔۔۔۔ ذاتی طور پر میں ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے۔ خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خوداختیاری حاصل کرے، خواہ اس کے باہر، مجھے تو ایسے نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو آخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی۔۔۔۔۔ غالباً قسمت انبالہ یا اس قسم کے دوسرے اضلاع کو الگ کر دینے سے، جن میں ہندو آبادی کا غلبہ ہے، اس کی وسعت اور انتظامی مشکلات میں اور بھی کمی ہو جائے گی۔ پھر ان اضلاع کی علیحدگی سے غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کہیں زیادہ مضبوط ہو جائیں گے۔۔۔۔۔ ہندوستان دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے۔۔۔۔۔ اگر شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو اس امر کا موقع دیا گیا کہ وہ ہندوستان کے جسد سیاسی کے اندر رہ کر اپنے نشوو ارتقاء میں آزادانہ قدم اٹھا سکیں تو وہ تمام بیرونی حملوں کے خلاف، خواہ وہ حملہ بزور قوت ہو یا بزور خیالات، ہندوستان کے بہترین محافظ ثابت ہوں گے۔" (۲)

اس کے بعد علامہ محمد اقبال نے "فیڈرل ریاستیں" کے ذیلی عنوان سے سیاسی بصیرت اور پیش بینی سے کام لیتے ہوئے فکر انگیز بحث کی ہے۔ وہ کہتے ہیں :

"اگر ہم ہندوستان کی آئندہ حکومت کے لئے کسی مستقل دستور کی بناء رکھنا چاہتے ہیں تو ہندوستان کے جغرافی، نسلی، لسانی اور عقائد و معاشرت کے اختلافات کو مد نظر

رکھتے ہوئے ایسی آزاد ریاستیں قائم کر دیں' جو زبان' نسل' تاریخ' مذہب اور اقتصادی مفاد کے اشتراک پر مبنی ہوں ــــــ اگر صوبوں کی تقسیم کسی ایسے اصول کے ماتحت عمل میں آ جائے کہ ہر صوبے کے اندر تقریباً ایک ہی طرح کی ملتیں بستی ہوں اور ان کی نسل' ان کی زبان' ان کا مذہب اور ان کی تہذیب و تمدن ایک ہو تو مسلمانوں کو مخلوط انتخابات پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔" (۷)

اس کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کے دو عوارض (شخصیتوں کا وجود نہیں' اطاعت کا مادہ نہیں) کا ذکر کرتے ہوئے "خاتمہ سخن" کے ذیلی عنوان کے تحت کہتے ہیں :

"ہندوستان کی سیاسی غلامی تمام ایشیا کے لئے لامتناہی مصائب کا سرچشمہ ہے۔ اس نے مشرق کی روح کو کچل ڈالا ہے اور اسے اظہار ذات کی اس مسرت سے محروم کر دیا ہے' جس کی بدولت کبھی اس میں ایک بلند اور شاندار تمدن پیدا ہوا تھا۔ــــــ موجودہ نازک حالات کے تدارک کے لئے ہماری ملت کو مستقبل قریب ہی میں آزادانہ جدوجہد کرنا پڑے گی' لیکن کسی سیاسی طرز عمل کے لئے آزادانہ جدوجہد کرنا اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے' جب پوری قوم اس پر آمادہ ہو اور ان کے تمام عزائم اور ارادے ایک ہی مقصد پر مرتکز ہو جائیں۔" (۸)

ب) تصور پاکستان کے سیاسی و فکری خدوخال

علامہ اقبال کے اس خطبے کے تجزیاتی مطالعے سے مندرجہ ذیل نکات نمایاں ہوتے ہیں :

۱۔ برصغیر میں اقبال کی توجہ کا مرکز شمال مغرب کے مسلمان رہے ہیں۔ بنگالی مسلمانوں کی فکری اور سیاسی بیداری سے اقبال بہت زیادہ انسیت محسوس نہیں کرتے۔

۲۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد موجودہ پاکستان کا جغرافیائی نقشہ وہی ہے' جو اقبال کی مجوزہ ریاست کا ہے۔

۳۔ ابھی چونکہ مسلم لیگ نے کامل آزادی کو اپنا نصب العین قرار نہیں دیا تھا' اس لئے اقبال ایک قدم آگے بڑھ کر نئی ریاست کو سلطنت برطانیہ کے اندر یا باہر

قائم کرنے کی خواہش ظاہر کر رہے ہیں' "یا" کا استعمال معنی خیز ہے' کیونکہ داخلی خودمختاری سے زیادہ کا تصور بیشتر سیاسی رہنماؤں نے کبھی نہیں کیا تھا۔

۴۔ اقبال ایک علیحدہ ریاست کے قیام کے مطالبے کے ساتھ ساتھ پورے ہندوستان کے وفاق کے اندر فرقہ وارانہ عناد کو حل کرنے کے بھی خواہاں ہیں' جس کی وجہ سے وہ صوبوں کی از سر نو تقسیم کی بات کرتے بھی دکھائی دیتے ہیں۔

۵۔ انبالہ ڈویژن اور دیگر اضلاع کو علیحدہ کرنے کی بات کر کے وہ صوبہ پنجاب کی تقسیم کے اس تصور کو پیش کر رہے ہیں' جس پر چودھری خلیق الزماں ایسے راہنماؤں اور مصنفوں نے مسلم لیگی قیادت کو بعد میں مطعون کیا۔

۶۔ اقبال برصغیر کی دو بڑی قوموں کے مابین جداگانہ انتخاب اور مخلوط انتخاب کے سوال پر پائے جانے والے ڈیڈ لاک یا تعطل کو بھی توڑنے کے خواہاں ہیں' چنانچہ وہ مسلمانوں کی دلجوئی کے لئے بعض تحفظات (مجوزہ ریاست' صوبوں کی از سر نو تقسیم' مسلمانوں کو اپنے تمدن اور ثقافت کی آزادانہ نشوونما کا حق) کے ملنے پر مخلوط طریق انتخاب کو بھی ماننے پر آمادہ دکھائی دیتے ہیں' حالانکہ قائداعظم اور مسلم لیگ شفیع گروپ (جس کے سیکرٹری علامہ اقبال تھے) کے مابین بڑی وجہ نزاع یہی مسئلہ رہا ہے۔

۷۔ اقبال ایک علیحدہ ریاست مسلمانان برصغیر کی اجتماعی خودی کی حفاظت اور ارتقاء کے لئے چاہتے ہیں۔

۸۔ وہ نئی ریاست کو اسلامی نشاۃ الثانیہ کے ایک مرکز اور اہم حوالے کے طور پر اہمیت دیتے ہیں۔

۹۔ وہ انگریزوں کی طرف سے دستوری مراعات اور جمہوری ڈھانچے کی حتمی تشکیل سے پہلے برصغیر کے مسلمانوں کو بالادست اکثریت کی زیادتی سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔

۱۰۔ وہ خود کو مسلمانوں کے سیاسی رہنما کی بجائے مفکر کے طور پر پیش کرنا پسند کرتے ہیں۔

۱۱۔ وہ مسلمانانِ برصغیر کی مراعات اور تحفظات کے عوض برطانیہ کو ہندوستان پر بیرونی قوت اور بیرونی نظریے (کمیونزم' فاشزم) کے حملے کے خلاف مزاحمت

میں تعاون دینے پر آمادہ ہیں۔

۱۲۔ اسلامی ریاست کو وہ جارحانہ عزائم کی تکمیل کا وسیلہ خیال کرنے کی بجائے مثالی اسلامی اخلاق کا مظہر دیکھنا چاہتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد نظریہ پاکستان کے حوالے سے پاکستان کے مذہبی تشخص کو نمایاں کرنے والے حلقے ہمیشہ علامہ اقبال کے اس خطبے کا بھی حوالہ دیتے رہے ہیں۔

ج) ردعمل، کثرت تعبیر

عتیق صدیقی یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اقبال تصور پاکستان کے خالق نہیں، لکھتے ہیں :

"ہندوستان میں ایک مسلم ہندوستان کے قیام کی جس تجویز سے اقبال نے اتفاق کیا تھا، اس کے خالق اقبال نہیں تھے بلکہ مسلم لیگ کے اجلاس (۱۹۳۰) سے دو سال قبل (۱۹۲۸) میں وہ تجویز آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں منظور کی گئی تھی جو سر فضل حسین کے ایماء سے سر آغا خان کی صدارت میں دہلی میں منعقد ہوئی تھی۔"(۹)

حالانکہ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے قیام کے پس منظر پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ اس کانفرنس کے اہم فیصلوں، قرار دادوں اور تقریروں کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان کا بغور جائزہ یہی نتیجہ اخذ کرنے میں مدد دیتا ہے کہ اقبال کا خطبہ الہ آباد یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو منعقد ہونے والی آل پارٹیز مسلم کانفرنس (زیر صدارت سر آغا خان) کی ان قرار دادوں کی محض تجدید نہیں :

(i) مسلمان کسی شرط پر اور کسی بھی صورت میں جداگانہ انتخاب کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ (ii) سندھ کو احاطہ بمبئی سے الگ کیا جائے۔ (iii) شمال مغربی صوبہ سرحد اور بلوچستان میں دیگر صوبجات ہند کی طرح اصلاحات رائج کی جائیں۔ (iv) ہندوستان کی حکومت فیڈرل طرز پر قائم کی جائے۔ (v) اختیارات مابقی مرکز کی بجائے صوبوں کو تفویض کئے

جائیں۔ (vi) مرکزی اسمبلی میں ایک تہائی نشستیں مسلمانوں کو دی جائیں۔(۱۰)

آل پارٹیز کانفرنس کی قرار دادیں مسلمانان برصغیر کے لئے تحفظات کی اس جدوجہد کا تسلسل ہیں، جس کا باقاعدہ آغاز شملہ وفد سے ہوا تھا، جبکہ علامہ اقبال کا خطبہ الہ آباد باقاعدہ ایک ریاست (مختلف صوبوں پر مشتمل) کا تصور پیش کرتا ہے۔

ڈاکٹر قاضی عبدالمجید لکھتے ہیں :

"۱۹۳۴ء میں یورپ کو روانگی سے قبل، علامہ نے لکھنؤ کے خطبہ صدارت میں فرمایا تھا کہ ہم کو پنجاب، سندھ اور بلوچستان وغیرہ کو ملا کر ایک اسلامی صوبہ بنا لینا چاہیے۔ اس پر اخبارات میں بڑی دھوم مچی اور اقبال پر الزامات عائد کئے گئے کہ وہ ہندوستانی قومیت کو برباد کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے اس کے متعلق ان سے دریافت کیا تو فرمانے لگے کہ میں ضرور چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں اسلامی تہذیب و تمدن کے لئے ایک مرکز ہو اور یہ مرکز ظاہر ہے کہ صرف شمالی ہند کا صوبہ ہو سکتا ہے، لیکن اس سے میرا یہ مفہوم نہیں کہ وہ ہندوستان کا ایک جزو ہو کر نہ رہے۔"(۱۱)

ڈاکٹر قاضی کے دعوے کے آغاز میں ہی دو تاریخی غلطیاں ہیں : ایک تو اقبال ۱۹۳۱ء میں (دوسری گول میز کانفرنس کے لئے) لندن گئے تھے، ۱۹۳۴ء میں نہیں۔ دوسرے انہوں نے خطبہ صدارت الہ آباد میں دیا تھا، لکھنؤ میں نہیں ------- سطور بالا میں یہ وضاحت ہو چکی کہ اقبال صوبوں پر مشتمل ایک ریاست کا تصور پیش کر رہے تھے، ایک صوبے کا نہیں، البتہ سیاسی جدوجہد کے ارتقاء کا ایک مرحلہ یہ ہو سکتا ہے کہ اقبال مقتدر (Sovereign) ریاست کی بجائے اس وقت خود مختار (Autonomous) ریاست کا تصور پیش کر رہے تھے، مگر بعد میں اس کی فیصلہ کن سیاسی جدوجہد اور قائداعظم کے نام مکاتیب میں وہ کھل کر ایک مقتدر ریاست کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی معروف کتاب (Discovery of India) میں

لکھتے ہیں :

"اقبال پاکستان کے اولین حامیوں میں سے ایک تھے، تاہم انہوں نے اس کے مضمر خطرے اور اس کی لایعنیت کو محسوس کر لیا تھا۔ ایڈورڈ تھامسن نے لکھا ہے کہ ایک گفتگو کے دوران اقبال نے ان سے کہا تھا کہ انہوں نے پاکستان کی وکالت اس لئے کی تھی کہ ان کی حیثیت مسلم لیگ کے اجلاس کے صدر کی تھی، لیکن انہیں یقین تھا کہ یہ (تجویز) ہندوستان کے لئے بحیثیت مجموعی اور مسلمانوں کے لئے خاص طور پر نقصان دہ ہوگی۔" (۱۲)

پنڈت نہرو نے جس پروفیسر ایڈورڈ تھامسن کا حوالہ دیا ہے، انہوں نے اپنی دو کتابوں (Earliest India for Freedom) (لندن ـ ۱۹۴۰) اور (Ethical Ideals in India Today) (۱۹۴۲) میں یہ روایت درج کی ہے۔ اول الذکر کتاب میں وہ لکھتے ہیں :

"آبزرور میں ایک مرتبہ میں نے لکھا تھا کہ انہوں نے پاکستان منصوبے کی حمایت کی تھی۔ اقبال میرے ایک دوست تھے، انہوں نے میرے غلط تصور کی اصلاح کر دی۔۔۔۔۔ انہوں نے فرمایا کہ پاکستان کا منصوبہ برطانوی حکومت کے لئے تباہ کن ہے، ہندو فرقہ کے لئے تباہ کن ہے، آخر میں انہوں نے کہا لیکن میں مسلم لیگ کا صدر ہوں، اس لئے میرا فرض ہے کہ میں اس تجویز کی حمایت کروں۔" (۱۳)

جبکہ دوسری کتاب میں وہ روایت کے تضاد کے ساتھ لکھتے ہیں :

"انہوں نے (اقبال نے) اپنے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے جب کہ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں، مجھ کو ایک خط میں نہایت دل شکستگی اور رنج و افسوس کے ساتھ لکھا تھا کہ میرے وسیع، غیر منظم اور فاقہ کش ملک میں طوائف الملوکی برپا ہوتی نظر آتی ہے۔" (۱۴)

محمد احمد خان نے اپنی کتاب "اقبال کا سیاسی کارنامہ" میں ایڈورڈ تھامسن کے بیانات کی صحت کو مشکوک قرار دیا ہے۔ ان کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے:(۱۵)

۱۔ اول الذکر روایت میں گفتگو کا ذکر ہے، جبکہ موخرالذکر میں مکتوب کا۔

۲۔ ابھی مسلم لیگ نے علیحدہ وطن کو اپنا نصب العین قرار نہیں دیا تھا، اس لئے خطبہ الہ آباد پیش کرتے وقت اقبال اخلاقی طور پر پابند نہیں تھے کہ وہ اس "تجویز" کی حمایت کریں، دوسرے وہ جگہ جگہ خطبے میں "میری ذاتی رائے میں"۔۔۔۔۔ "شخصی طور پر میں"۔۔۔۔۔ "میری یہ خواہش ہے"۔۔۔۔۔ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

۳۔ قائداعظم کے نام اقبال کے مکتوبات مذکورہ روایت کی نفی کر دیتے ہیں۔

۴۔ جب علامہ اقبال کو ستمبر ۱۹۳۱ میں دوسری گول میز کانفرنس منعقدہ لندن میں شرکت کا موقع ملا تو اسی زمانے میں پروفیسر تھامسن نے "بانی اسلامی سازش" کے عنوان سے اخبار "ٹائمز" کی ۳ اکتوبر ۱۹۳۱ء کی اشاعت میں اپنا ایک مراسلہ شائع کرایا تھا، جس کا جواب علامہ اقبال نے دیا (جو اسی اخبار کی ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۱ء کی اشاعت میں شامل ہوا)، اس جواب میں علامہ اقبال نے پاکستان کو ہندوستان کے مقدر کی صورت گری کرنے والے تاریخی عوامل کی کارفرمائی کا لازمی نتیجہ قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ نتیجہ رونما ہو کر رہے گا۔

۵۔ علامہ اقبال کی اس تقریر پر جو انہوں نے نیشنل لیگ آف انگلینڈ کے ایک جلسے میں کی تھی (جس میں ہندوستان کے لئے "لامرکز" کی تجویز پیش کی تھی) پنڈت نہرو نے سخت تنقید کی تھی۔ علامہ اقبال نے اس کا جواب ۶ دسمبر ۱۹۳۳ء کو دیا، جس میں انہوں نے ہندوستان کے مسئلہ کا حل یہ تجویز کیا کہ ملک کو مذہبی، تاریخی اور تہذیبی بیانات اور ہم آہنگی کی بنیاد پر از سرنو تقسیم کر دیا جائے۔

محمد احمد خان نے قائداعظم سے منسوب پروفیسر تھامسن کے انٹرویو کا بھی ذکر کیا ہے جس کی تردید قائداعظم نے فی الفور ایک اخباری بیان کے ذریعے کی کہ ان کی مصنف سے کبھی ملاقات ہوئی ہے اور نہ انہوں نے کبھی وہ الفاظ کہے ہیں جو مصنف نے ان سے منسوب کئے ہیں۔(۱۶)

عتیق صدیقی نے پروفیسر تھامسن کے حوالے سے ایک اور راویت کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

۱۹۳۴ء کے اوائل میں لندن کے اخبار OBSERVER میں اقبال کے خطباتِ مدراس پر کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر ایڈورڈ تھامسن کا لکھا ہوا تھا' تھامسن اقبال کے دوست تھے اور ان سے اقبال کی خط و کتابت بھی تھی۔ تھامسن نے بر سبیلِ تذکرہ اقبال کو پاکستان کی سکیم کا حامی لکھ دیا تھا' یہ تبصرہ پڑھتے ہی انہوں نے ۴ مارچ کو تھامسن کو خط میں لکھا :

> "آپ نے مجھے پاکستان نامی سکیم کا حامی کہا ہے مگر اب پاکستان میری سکیم نہیں رہی' اپنے خطبے میں جو سکیم میں نے پیش کی تھی وہ ایک مسلم صوبے کے قیام کی ہے' یعنی شمال مغربی ہند میں ایک ایسے صوبے کا قیام عمل میں آئے جس میں بھاری اکثریت مسلمانوں کی ہے' مگر پاکستان کی سکیم یہ ہے کہ مسلم صوبوں کی ایک جداگانہ وفاقی ریاست کا قیام عمل میں آئے' جس کی حیثیت ایک ڈومینین کی ہو اور اس کا انگلستان سے براہ راست رشتہ ہو۔ یہ سکیم کیمبرج سے شروع کی گئی ہے اور اس کے مصنفوں کا خیال ہے کہ گول میز کانفرنس کے ہم مسلم ممبروں نے ہندو' یا نام نہاد ہندوستانی قوم پرستی کی قربان گاہ پر مسلم قوم کو قربان کر دیا ہے۔" (۱۷)

عتیق صدیقی نے اقبال کے اس خط کا ماخذ حسن احمد کی کتاب Iqbal -- His Political Ideas کو قرار دیا ہے۔ اول تو اقبال کا یہ خط ان کے کسی مستند مجموعہ تقاریر و مکاتیب میں شامل نہیں اس لئے یہ بھی ہو سکتا ہے (درج بالا شواہد کی روشنی میں) کہ مکتوب میں کلی یا جزوی طور پر تحریف کی گئی ہو' دوسرے اقبال کے مبینہ خط کے مذکورہ اقتباس میں دو حصے بے حد معنی خیز ہیں :

> "اب پاکستان میری سکیم نہیں رہی۔"

"یہ سکیم کیمبرج سے شروع کی گئی ہے اور اس کے مصنفوں کا خیال ہے کہ گول میز کانفرنس کے ہم مسلم ممبروں نے ہندو یا نام نہاد ہندوستانی قوم پرستی کی قربان گاہ پر

مسلم قوم کو قربان کر دیا ہے۔"

ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال چودھری رحمت علی اور ان کے ساتھیوں کی اس الزام تراشی پر آزردہ تھے جو انہوں نے گول میز کانفرنس کے مسلم شرکاء پر کی تھی اور ہندو پریس اس پاکستانی سکیم کو اچھال رہا تھا' جو اب چودھری رحمت علی سے منسوب ہو گئی تھی۔

د) دیگر تجاویز پاکستان

شریف الدین پیرزادہ نے اپنی کتاب "پاکستان منزل بہ منزل" (مطبوعہ انجمن پریس کراچی' ۱۹۶۵) میں خطبہ الہ آباد سے پہلے اور بعد میں (قرارداد پاکستان ۱۹۴۰ سے پہلے) کچھ ایسی تجاویز اور تصورات کا ذکر کیا ہے جن سے اس بحث کا جواز فراہم ہوتا ہے کہ تصور پاکستان کا بانی کون ہے؟

سرسید احمد خان کا ذکر پہلے باب میں ہو چکا ہے' جنہیں دو قومی نظریے کا پہلا سیاسی پرچارک قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ایک ادیب ولفریڈ سکاون بلسٹ کی کتاب Ideas about India کے اس اقتباس کا حوالہ بھی پیرزادہ نے مذکورہ کتاب میں دیا ہے :

> "ہندوستان ایک بہت ہی وسیع و فراغ براعظم جیسا ہے اور یہ ایک ایسی کثیر رنگ برنگی اور گوناگوں نسلوں سے آباد اور معمور ہے کہ یہ قطعاً ممکن نظر نہیں آتا کہ ان کو ملا کر اور ایک دوسرے میں مدغم کر کے کوئی ایک واحد اسمبلی تشکیل دی جائے' جو ان نمائندوں پر مشتمل ہو' جو کسی قابل تصور یا ممکنہ ضابطہ اور طریقہ انتخاب کے ذریعہ منتخب ہو سکیں۔" (۱۸) اپنی اس رائے کی بنیاد پر دسمبر ۱۸۸۳ء میں بلسٹ نے یہ تجویز پیش کی کہ "شمالی ہند کے تمام صوبوں کو عملی طور پر مسلم حکومت کے تحت دے دیا جائے اور جنوبی ہند کے صوبوں کو ہندو حکومت کے تحت۔" (۱۹)

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے اردو کے نامور ناول نگار عبدالحلیم شرر کے ہفت

روزہ "مہذب" کے اس شذرہ کا حوالہ دیا ہے، جو ۲۳ اگست ۱۸۹۰ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا :

"ہمارے خیال میں اگر ایسا ہی وقت آگیا ہے کہ کسی کی مذہبی رسوم بغیر دوسرے کی توہین و دل شکنی کے پوری نہیں ہوتیں اور نہ اتنا صبر و تحمل ہے کہ دوسرا فریق ان باتوں کو طرح دے تو ہندوستان کے اضلاع کو ہندو مسلمان باہم تقسیم کرلیں اور اپنی اپنی آبادیاں علیحدہ کرلیں۔"(۲۰)

سابق پرنسپل علی گڑھ کالج سر تھیوڈور ماریسن نے بھی ۱۸۹۹ء میں لکھا تھا :

"اگر ہندوستان کے پانچ ملین مسلمان کسی صوبہ یا ملک کے کسی حصہ میں جمع کردئے جائیں، مثال کے طور پر شمالی ہند میں تو ایک قومی سپرٹ ان علاقوں میں پیدا ہو جائے گی جس سے حالیہ مسئلہ کا جزوی حل ہو سکتا ہے۔"(۲۱)

اردو کے نامور مزاح نگار ولایت علی بمبوق نے مولانا محمد علی جوہر کے اخبار "کامریڈ" کے ۱۰ مئی ۱۹۱۳ء کے شمارے میں ایک خیالی انٹرویو لکھا تھا، جس میں یہ سوال اور جواب بے حد بلیغ اور اہم ہے :

سوال : ہندو مسلم مسئلہ آپ کس طرح حل کریں گے؟

جواب : ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دینا چاہئے۔ شمالی ہند مسلمانوں کے حوالہ کر دیا جائے اور ما بقی ہندوؤں کے۔(۲۲)

ڈاکٹر عبد الجبار خیری اور پروفیسر عبد الستار خیری (علی گڑھ یونیورسٹی) نے پہلی جنگ عظیم کے دوران ستمبر یا اکتوبر ۱۹۱۷ء میں اسٹاک ہوم (سویڈن) میں سوشلسٹ انٹرنیشنل کے ایک اجلاس میں ایک تحریری یادداشت میں ہندوستان کو 'ہندو ہندوستان' اور مسلم ہندوستان میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔(۲۳)

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے عبد القادر بلگرامی کو گاندھی جی کے نام ایک کھلی چٹھی میں ذکر کیا ہے، جو بدایوں کہ ایک اخبار "ذوالقرنین" میں (مارچ اور اپریل ۱۹۲۰ء) شائع کرائی تھی، جس میں برعظیم کی ایسی تقسیم کے لئے اضلاع کی ایک فہرست بھی

دے دی گئی، جو مغربی اور مشرقی پاکستان کی بعد کی حدود سے بہت مختلف نہیں تھی۔ (۲۴)
(محمد احمد خان نے اپنی کتاب "اقبال کا سیاسی کارنامہ" میں شواہد سے ثابت کیا ہے کہ دراصل یہ چٹھی عزیز الدین احمد بلگرامی نے لکھی تھی، مگر سرکاری ملازمت کے باعث اپنے بھائی محمد عبدالقدیر (نہ کہ عبدالقادر) کے نام سے شائع کرائی۔) (۲۵)

چودھری خلیق الزماں نے اپنی کتاب "پاتھ وے ٹو پاکستان" میں آگرہ کے ایک وکیل نادر علی کے ایک کتابچے کا بھی ذکر کیا ہے، جس میں ہندوستان کی تقسیم کی تجویز پیش کی گئی تھی۔(۲۶)

ڈیرہ اسمٰعیل خان کی انجمن اسلامیہ کے صدر سردار محمد گل خاں کی صوبہ سرحد کی تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے ۱۹۲۳ء کو دی گئی اس شہادت کو بھی تاریخی اہمیت حاصل ہے:۔

"ہم ہندو اور مسلمانوں کی علیحدگی کو پسند کریں گے۔ ۲۳ کروڑ ہندو جنوب میں اور ۸ کروڑ شمال میں، ہندوؤں کو راس کماری تا آگرہ کا علاقہ اور مسلمانوں کو آگرہ تا پشاور کا خطہ دے دیجئے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ایک مقام سے دوسرے مقام میں تبالہ آبادی ہو۔"(۲۷)

مولانا حسرت موہانی نے ۱۹۲۴ء میں یہ منصوبہ پیش کیا تھا :

۱۔ مستقبل کی آزاد ریاست ہند کے لئے دو قومی بنیاد تسلیم کریں۔
۲۔ مسلم اکثریتی صوبوں کو مسلم ریاستوں اور ہندو اکثریتی صوبوں کو ہندو ریاستوں میں تبدیل کریں اور
۳۔ ان ریاستوں کا ایک ہندوستانی وفاق قائم کر کے اس کو ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل اعلیٰ اختیاری قومی حکومت کے تحت کر دیں۔(۲۸)

لالہ لاجپت رائے نے بھی ۱۹۲۴ء میں یہ سکیم پیش کی تھی :
"میری سکیم کے تحت مسلمانوں کو چار مسلم ریاستیں ملیں گی۔ (۱) پٹھان صوبہ یا شمال مغربی صوبہ سرحد (۲) مغربی پنجاب، سندھ اور (۴) مشرقی بنگال۔ اگر ہندوستان کے کسی اور حصہ میں مسلمانوں

کے ایک دوسرے سے پیوست علاقے ہیں اور اس حد تک وسیع کہ ایک صوبہ کی صورت اختیار کر سکیں تو انہیں بعینہٖ اسی طرح ترتیب دے دیا جائے، لیکن بالکل واضح طور پر سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ ایک متحدہ ہندوستان نہیں ہے۔ اس کا صاف مطلب ہے، ہندوستان کی تقسیم، مسلم ہندوستان اور غیر مسلم ہندوستان میں۔(۲۹)

دسمبر ۱۹۲۸ء میں نامور صحافی مولانا مرتضیٰ احمد خاں نے ہندو مسلم مسئلہ کا حل ایک مسلم قومی وطن کے قیام کو قرار دیا جو پنجاب، سندھ، بلوچستان اور شمال مغربی صوبہ سرحد پر مشتمل ہو۔(۳۰)

۲۸ جنوری ۱۹۳۳ء کو چودھری رحمت علی نے لندن میں چار صفحات پر مشتمل ایک انگریزی پمفلٹ (Now Or Never) شائع کیا، جس پر ان کے علاوہ محمد اسلم، شیخ محمد صدیق اور عنائت اللہ خان کے دستخط تھے۔ اس میں انہوں نے برصغیر ہند میں مسلم صوبوں کے ایک علیحدہ وفاق کا مطالبہ کیا تھا اور کہا تھا کہ مسلم اکثریت کے پانچ علاقوں پنجاب، افغانیہ (صوبہ سرحد)، کشمیر، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ایک آزاد، خودمختار مسلم مملکت پاکستان قائم کی جائے۔(۳۱)

حوالہ جات

۱۔ "علامہ محمد اقبال کا خطبہ صدارت" مترجم سید نذیر نیازی۔ "اقبال" لاہور۔ جلد ۳۸،۳۹ شمارہ ۴۔ا ص ۱۷۲۔۱۷۳

۲۔ ایضاً ص ۱۷۳۔۱۷۴

۳۔ ایضاً ص ۱۷۶

۴۔ ایضاً ص ۱۷۷۔۱۷۸

۵۔ ایضاً ص ۱۷۹

۶۔ ایضاً ص ۱۸۰۔۱۸۱

۷۔ ایضاً ص ۱۸۲۔۱۸۳

۸۔ ایضاً ص ۱۹۷۔۱۹۸

۹۔ "اقبال جادوگر ہندی نژاد" دہلی۔۸۰، ص ۱۲۹۔۱۳۰

۱۰۔ "اقبال کے آخری دو سال" کراچی۔ طبع ثانی، ص ۲۳۴

۱۱۔ "اقبال کی شخصیت اور اس کا پیغام" اردو اقبال نمبر ۳۸۔ ص ۱۹۵۔۱۹۶

۱۲۔ "ڈسکوری آف انڈیا" (انگریزی) لندن۔ ۵۱، ص ۳۳

۱۳۔ "بحوالہ اقبال کا سیاسی کارنامہ" از محمد احمد خاں لاہور۔ ۷۷، ص ۸۳۱

۱۴۔ ایضاً ص ۸۳۱۔۸۳۲

۱۵۔ ایضاً ص ۸۳۲۔۸۴۰

۱۶۔ ایضاً ص ۸۴۱

۱۷۔ "اقبال۔ جادوگر ہندی نژاد" ص ۱۳۱

۱۸۔۱۹ "پاکستان منزل بہ منزل" ص ۱۶۳

۲۰۔ "صحافت پاکستان و ہند میں" از ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، لاہور ۶۳، ص ۲۷۰۔۲۷۱

۲۱۔ بحوالہ "اقبال کا سیاسی کارنامہ" ص ۸۶۷

۲۲۔ "پاکستان منزل بہ منزل" ص ۱۱۱

۲۳۔ ایضاً ص ۱۱۴

۲۴۔ "براعظم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" مترجم ہلال احمد زبیری، کراچی ۶۷، ص ۳۸۴

۲۵۔ "اقبال کا سیاسی کارنامہ" ص ۸۷۳

۲۶۔ "پاتھ وے ٹو پاکستان" (انگریزی) ص ۲۳۸

۲۷۔ "اقبال کا سیاسی کارنامہ" ص ۸۸۴

۲۸۔ "پاکستان منزل بہ منزل" ص ۱۲۳

۲۹۔ "محمد علی جناح۔ اے پولیٹکل سٹڈی" از مطلوب الحسن سید، ص ۲۳۰

۳۰۔ "پاکستان منزل بہ منزل" ص ۱۵۱

۳۱۔ "اقبال کا سیاسی کارنامہ" ص ۸۹۵

باب چہارم

قائداعظم اور علامہ اقبال

اختلاف سے اشتراک عمل تک

الف) تحریک پاکستان کے دو مرکزی کردار' قائداعظم اور علامہ اقبال
ب) قائداعظم اور علامہ اقبال کے اختلافات کے مرکزی نکات
ج) قائداعظم اور علامہ اقبال کی ذہنی قربت اور سیاسی ہم آہنگی
د) دونوں زعماء کی باہمی رائے

الف) تحریک پاکستان کے دو مرکزی کردار‘ قائداعظم اور علامہ اقبال

تحریک آزادی میں برصغیر کے کئی مسلم مشاہیر کی گراں قدر خدمات ہیں۔ ان میں حسرت موہانی‘ ظفر علی خان‘ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی ایسے سیاسی رہنما بھی شامل ہیں جنہوں نے قیدوبند کی صعوبتیں برداشت کیں‘ مقدمات کا سامنا کیا‘ پریس ضبط ہوئے‘ جرمانے ہوئے‘ مگر پاکستانی عوام کے دلوں میں جن دو مرکزی کرداروں کا بے پناہ احترام ہے اور جن کے بارے میں ان کے عوامی شعور نے تمام تاریخی و سیاسی عقدوں کی گرہ کشائی کر کے یہ طے کر رکھا ہے کہ قیام پاکستان دو محسنوں کا فیض ہے۔ علامہ اقبال نے خداداد تخیل سے پاکستان کا خواب دیکھا اور قائداعظم نے اپنی استقامت اور سیاسی بصیرت سے اس کی تعبیر حاصل کی اور یہ محض اتفاق نہیں کہ دونوں شخصیتوں نے مغرب کی اعلیٰ درسگاہوں سے فیض حاصل کیا۔ دونوں وکالت کے پیشے سے منسلک تھے‘ دونوں کی سیاسی فکر کا نقطہ آغاز ہندوستانی قوم پرستی اور نقطہ کمال ایک علیحدہ مسلم وطن کا حصول ہے‘ دونوں اسمبلی کے رکن رہے‘ گول میز کانفرنسوں میں شرکت کی‘ تحریک آزادی میں نمایاں کردار ادا کرنے کے باوجود ایک دن بھی قیدوبند میں نہیں رہے۔(۱)

علامہ اقبال بنیادی طور پر مفکر اور شاعر تھے اور عوام و خواص میں ان کی بنیادی پہچان یہی تھی‘ جبکہ قائداعظم کی بنیادی شہرت قانون دانؔ اور سیاسی رہنما کی تھی۔ علامہ اقبال کی قیام گاہ خاص و عام کے لئے ہروقت کشادہ تھی‘ جبکہ قائداعظم کم آمیز اور تعلقات میں سماجی ضبط کے قائل تھے۔ قائداعظم کا تعلق ایک متمول تاجر گھرانے سے تھا (کاروباری نشیب و فراز کے باوجود) جبکہ علامہ اقبال کا تعلق ایک سفید پوش گھرانے سے تھا۔ قائداعظم کی سیاست کا انداز کل ہند تھا‘ جبکہ علامہ اقبال کی عملی سیاست کا زیادہ رخ پنجاب کی طرف رہا۔

دونوں قائدین برصغیر کے مسلمانوں کے لئے تحفظات کے قائل تھے اور سرسید احمد خان کی طرح ان تحفظات کے حصول سے پہلے جمہوری سانچے (اکثریت کے حق حکمرانی) کو مسلمانوں کے لئے نقصان دہ خیال کرتے تھے۔ دونوں جدید تمدنی‘ معاشی اور سیاسی نظریات سے آگاہ تھے اور بعض مسلمان زعماء کی طرح مسلمانوں کو جذبات کی دلدل

میں دھکیلنے کے قائل نہ تھے۔ اقبال اسلامی نشاۃ الثانیہ کے بارے میں ایک واضح موقف رکھتے تھے، مگر وہ مذہب کو فرقہ وار تنگ نظری اور جمود کے محاصرے سے نکالنے کے لئے کوشاں تھے جبکہ قائداعظم تو "مولانا محمد علی جناح" کے نعرے پر سخت ناراض ہوئے تھے۔

ب) قائداعظم اور علامہ اقبال کے اختلافات کے مرکزی نکات

کم و بیش دو عشروں تک قائداعظم اور علامہ اقبال کی سیاسی راہیں جدا رہیں۔ ایک دوسرے کے موقف سے برملا اختلاف کا اظہار بھی کیا گیا، خاص طور پر اس زمانے میں جب مسلم لیگ دو حصوں میں تقسیم ہو گئی، ایک جناح لیگ اور دوسری شفیع لیگ کہلائی۔ موخرالذکر کے سیکرٹری علامہ محمد اقبال رہے۔۔۔۔۔ ذیل میں وہ مرکزی نکات پیش کئے جاتے ہیں جو دونوں عظیم شخصیتوں کے مابین موجب اختلاف رہے۔

ا۔ جداگانہ انتخاب

مسلمانوں کے قیادت کے مطالبے کے نتیجے میں منٹو مارلے اصلاحات (۱۹۰۹) کے تحت مسلمانوں کو جداگانہ انتخابات کا حق ملا۔ کانگریس نے میثاق لکھنؤ (۱۹۱۶) کے موقع پر اس حق کو تسلیم کیا، مگر کچھ عرصہ کے بعد ہندوؤں کی قیادت کی جانب سے اس کے خلاف شدید ردعمل ظاہر ہونا شروع ہوا۔ علامہ محمد اقبال کا موقف تھا کہ مسلمانوں کے اس حق پر کسی قسم کا سمجھوتہ ممکن نہیں، مگر قائداعظم کا نقطہ نظریہ تھا کہ اگر مسلمانوں کے دوسرے حقوق تسلیم کرلئے جائیں اور اکثریت کی بالادستی کا خوف مسلمانوں کے قلب و ذہن سے دور کر دیا جائے تو مخلوط انتخاب کو تسلیم کرلینا چاہیے۔ اسی لئے قائداعظم نے ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو دہلی میں مسلمان رہنماؤں کی ایک کانفرنس طلب کی اور وہ تجاویز پیش کیں جو سیاسی تاریخ میں "تجاویز دہلی" کے نام سے مشہور ہوئیں۔(۲) جن کے مطابق اگر مسلمانوں کے مندرجہ ذیل مطالبات مان لئے جاتے تو مخلوط انتخاب کو قبول کیا جا سکتا تھا۔ پنجاب اور بنگال (مسلم اکثریتی دو صوبے) میں آبادی کے تناسب کے لحاظ سے

نمائندگی، سرحد اور بلوچستان میں آئینی اصلاحات، مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی ایک تہائی نمائندگی اور سندھ کی بمبئی سے علیحدگی۔(۳)

اس کانفرنس میں سر شفیع شامل تھے، مگر لاہور واپس جا کر انہوں نے ان تجاویز کے خلاف محاذ کھول دیا۔(۴) علامہ اقبال نے جو پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے، یکم مئی ۱۹۲۷ء کو پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے اجلاس میں اس کے خلاف قرارداد پیش کی۔ قائداعظم کو بھی احساس تھا کہ اس مسئلے پر مسلمانوں کی اکثریت ان کے موقف سے اختلاف رکھتی ہے۔ چنانچہ لکھنؤ یونیورسٹی میں ایک خطاب کے دوران انہوں نے کہا "میں خود مخلوط انتخاب اور آبادی کے اصول پر نشستوں کا حامی ہوں، لیکن میں قوم کی جانب سے اس کی ذمہ داری نہیں لے سکتا، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ مسلمانوں کی اکثریت جداگانہ انتخاب کے اصول پر قائم ہے۔"(۴)

۲۔ سائمن کمیشن

۸ نومبر ۱۹۲۷ء کو برطانوی حکومت نے ہندوستان میں دستوری اصلاحات کی کارکردگی کا جائزہ لینے اور نئی سفارشات پیش کرنے کے لئے سرجان سائمن کی قیادت میں ایک کمیشن مقرر کیا جس میں کوئی ہندوستانی رکن شامل نہ تھا، اس لئے ہندوستان کی بڑی بڑی سیاسی جماعتوں نے کمیشن کے بائیکاٹ کا اعلان کیا۔

۱۹ نومبر ۱۹۲۷ء کو قائداعظم کی تجویز پر بمبئی میں سر ڈنشا کی زیر صدارت ایک جلسہ منعقد ہوا۔ اس جلسے میں قائداعظم نے سائمن کمیشن کے خلاف ایک قرارداد پیش کی جس میں کہا گیا تھا:

> "اہل ہند اس کمیشن کو ہرگز قبول نہیں کر سکتے، جس میں ملک کے آئندہ آئین کی ترتیب و تشکیل میں ہندوستانی عوام کی شرکت و مساوی نیابت کے حق کو پامال کر دیا گیا ہے۔ یہ اجلاس اس امر کا بھی اعلان کرتا ہے کہ بحالت موجودہ ہندوستان کے لوگ اس کمیشن کی سفارشات کو قبول کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔"(۵)

جبکہ اس سے ایک ہفتہ پہلے پنجاب مسلم لیگ، کمیشن کے مقاطعہ کو مسلمانوں

کے مفاد کے لئے نقصان دہ قرار دے چکی تھی۔(۶) قائداعظم نے پنجاب پراونشل کانگریس کمیٹی کے ذریعے پنجاب کے عوام کو ایک تار دیا کہ وہ کمیشن سے کسی قسم کا تعلق یا واسطہ نہ رکھیں۔ علامہ اقبال نے اسی سال ۸ دسمبر کو نہ صرف کمیشن سے تعاون پر زور دیا' بلکہ اپنے اخباری بیان میں یہ بھی کہہ دیا :

"مسٹر جناح اور دیگر حضرات نے یہ فقرہ اڑا لیا ہے کہ ہماری خودداری ہمیں رائل کمیشن کی تائید کی اجازت نہیں دیتی۔ ہم اس کے برعکس کہتے ہیں کہ فرقہ وار جنگ اور خودداری یک جا قائم نہیں رکھی جاسکتیں۔"(۷)

۱۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو اپنے ایک اور بیان میں علامہ اقبال نے مسٹر جناح کو "چیف ایکٹر" کا خطاب دیتے ہوئے کہا :

"مسٹر جناح نے عجیب وقت نظر سے اپنے تین دل پسند امور پر زور دیا ہے۔ یعنی خودداری' مادر ہند سے وفاداری اور مقاطعہ کے فوائد۔۔۔۔۔۔ مسٹر جناح ہندوستانی قومیت کو مختلف فریب آمیز صورتوں میں مسلمانوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔"(۸)

۳۔ نہرو رپورٹ

۱۹ مئی ۱۹۲۸ء کو ہندوستان کی تمام قابل ذکر سیاسی جماعتوں نے ایک اجلاس میں ۹ ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی ہندوستان کے لئے متفقہ آئین تشکیل دینے کے لئے قائم کی' جس کے سربراہ پنڈت موتی لال نہرو تھے۔ اس میں دو مسلمان ارکان سر علی امام اور شعیب قریشی بھی تھے۔ اول الذکر نے کمیٹی کے کسی اجلاس میں شرکت نہ کی جبکہ موخرالذکر نے نہرو رپورٹ پر اختلافی نوٹ لکھا۔

نہرو رپوٹ نے مسلمانوں کے تمام اہم مطالبات نظرانداز کردئے تھے۔ اس رپورٹ کی اشاعت کے بعد مسلمان قوم تین واضح گروہوں میں تقسیم ہوگئی۔ نیشنلسٹ گروپ (مولانا ابوالکلام آزاد) اس رپورٹ کو من و عن قبول کرنے پر زور دے رہا تھا' جبکہ دوسرا گروپ' جس کی قیادت میاں شفیع اور علامہ اقبال کررہے تھے' نہرو رپورٹ کو

کسی بھی صورت قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا' جبکہ قائداعظم کی زیر قیادت تیسرا گروپ نہرو رپورٹ کو اس صورت میں قبول کرنے کے لئے تیار تھا بشرطیکہ اس میں مسلمانوں کے حسب منشاء ترامیم کرلی جائیں۔۔۔۔۔ مگر قائداعظم کو کانگریس کی ہندو قیادت کے بارے میں اپنے موقف پر نظرثانی کرنی پڑی جب ۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء کو آل پارٹیز کنونشن میں نہرو رپورٹ میں قائداعظم نے مندرجہ ذیل تین ترمیمیں پیش کیں :

۱۔ مرکزی اسمبلی کے انتخاب شدہ ممبروں میں ایک تہائی مسلمان ہوں۔

۲۔ اگر پنجاب اور بنگال میں بالغوں کو حق رائے دہندگی عطا نہ ہو سکے تو مخلوط انتخاب رائج کر کے کم از کم دس سال کے لئے مسلمانوں کی نشستیں ان کی آبادی کے تناسب سے مخصوص کی جائیں۔ دس سال بعد مسلمان اس تجویز پر نظرثانی کر سکتے ہیں۔

۳۔ اختیارات ما بقیٰ مرکزی حکومت کی بجائے صوبوں کو تفویض کئے جائیں۔(۹)

مگر کنونشن نے انہیں منظور نہ کیا

ج) قائداعظم اور اقبال کی ذہنی قربت اور سیاسی ہم آہنگی

قائداعظم نے ۲۶ مئی ۱۹۴۳ء کو انعام اللہ خاں کو اپنے خط میں اعتراف کیا ہے کہ اقبال اور ان کے درمیان ۱۹۲۹ء سے ہی خیالات میں یکسانیت اور ہم آہنگی پیدا ہو چکی تھی۔(۱۰) دراصل دسمبر ۱۹۲۸ء کے آل پارٹیز کانفرنس میں ہندو شرکاء نے قائداعظم اور محمد علی جوہر کے ساتھ جس طرز عمل کا مظاہرہ کیا تھا اور جس رعونت کے ساتھ قائداعظم کی ترامیم کو مسترد کیا تھا اس نے ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا "اب ہمارے تمہارے راستے جدا جدا ہیں۔"(۱۱) ادھر سائمن کمیشن کی سفارشات کی اشاعت کے بعد علامہ اقبال نے بھی ان پر مایوسی کا اظہار کیا اور کہا "ہمارے نزدیک اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ مسلمانوں کے اہم مطالبات کو ٹھکرا کر انتہا پسند ہندوؤں کو خوش کرنا مقصود ہے۔"(۱۲) چنانچہ ۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس کے سلسلے میں' لندن میں جناح اور

اقبال کا بامعنی رابطہ ہوا۔ اس سے پہلے بھی اختلافات کے باوجود دونوں مسلمان رہنماؤں میں بعض نکات پر لائحہ عمل کا اتفاق رہا ہے جن میں سندھ کی بمبئی سے علیحدگی، بلوچستان اور سرحد میں اصلاحات، ہندوستان میں وحدانی کی بجائے وفاقی طرز حکومت، پنجاب اور بنگال کے مسلم اکثریتی صوبوں میں اکثریت کے محفوظ رہنے جیسے مسائل شامل ہیں۔ پھر اسی طرح جب حکومت برطانیہ نے گول میز کی سفارشات پر مبنی ایک قرطاس ابیض شائع کیا تو ان دونوں رہنماؤں نے اسے مایوس کن قرار دیا۔ فلسطین کے مسئلے پر بھی دونوں زعماء کے رویے اور موقف میں اشتراک تھا۔

لاہور میں مسجد شہید گنج کو سکھوں نے گرانا شروع کیا اور پنجاب میں سکھ مسلم کشیدگی عروج پر تھی۔ اقبال نے قائداعظم کو دعوت دی کہ وہ مسلمانوں کے مقدمے کی پیروی کریں مگر قائداعظم اس سے پہلے ثالث کا کردار ادا کر چکے تھے، اس لئے انہوں نے علامہ اقبال کے ایلچی ملک برکت علی کو مشورہ دیا کہ وہ ایک انگریز بیرسٹر کولٹ مین کی خدمات حاصل کریں۔(۱۳) تاہم اس حوالے سے دونوں زعماء کے مابین رابطہ اور گرمجوشی ہوا۔

۱۲ اپریل ۱۹۳۶ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس نے قائداعظم کو اختیار دیا کہ وہ کم از کم ۳۵ ارکان پر مشتمل ایک مرکزی پارلیمانی بورڈ قائم کریں جو ہر صوبے کے مقامی حالات کے مطابق مختلف صوبوں میں صوبائی الیکشن بورڈ قائم کرے اور ان کا مرکزی بورڈ سے الحاق کرے۔(۱۴)

باب دوم میں ذکر ہو چکا ہے کہ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی قائم کرنے والوں کی منشاء کیا تھی اور علامہ اقبال کس طرح ان سے نبرد آزما ہوئے، مگر یونینسٹ پارٹی کے بانی سر فضل حسین کے پنجاب پر سیاسی اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب پنجاب میں پارلیمانی بورڈ کے قیام کے سلسلے میں قائداعظم لاہور تشریف لائے تو پہلے انہوں نے سر فضل حسین سے مذاکرات مناسب خیال کئے، مگر سر فضل حسین نے مسلم لیگ کے نام پر الیکشن لڑنے یا مجوزہ پارلیمانی بورڈ کے قیام میں تعاون سے انکار کر دیا۔ تب قائداعظم اور علامہ اقبال کی ملاقات ہوئی۔ قائداعظم نے جب تعاون کی درخواست کی تو علامہ اقبال نے جواب میں کہا :

"اگر آپ اودھ کے تعلقہ داروں یا بمبئی کے کروڑ پتی سیٹھوں کی قسم کے لوگ پنجاب میں تلاش کریں گے تو یہ جنس میرے پاس نہیں۔ میں صرف عوام کی مدد کا وعدہ کر سکتا ہوں۔"

یہ بات سن کر قائداعظم نے بڑے جوش سے کہا "مجھے صرف عوام کی مدد درکار ہے۔" (۱۵)

۲۱ مئی ۱۹۳۶ء کو قائداعظم نے ۵۶ رکنی مرکزی پارلیمانی بورڈ قائم کیا' تو اس میں علامہ اقبال سمیت پنجاب سے ۱۱ ارکان نامزد کئے گئے۔ اس کے بعد دونوں زعماء میں خط و کتابت کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو تحریک پاکستان سے متعلق اہم ترین دستاویزات ہیں۔ افسوس قائداعظم کے وہ مکتوبات نہ مل سکے جو انہوں نے علامہ اقبال کے خطوط کے جواب میں لکھے' البتہ علامہ اقبال کے خطوط' قائداعظم کے دیباچے کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں' جو اقبال اور قائداعظم کے فکری و سیاسی روابط کی اہم ترین شہادتیں ہیں۔

ان خطوط کے مرکزی نکات دو ہی ہیں۔ ایک مستقبل میں برصغیر کے مسلمانوں کی علیحدہ ریاست کا خاکہ یا مسلمانوں کا سیاسی و تہذیبی لائحہ عمل اور دوسرا یونینسٹوں کی ریشہ دوانیوں سے قائداعظم کو آگاہ رکھنا اور پنجاب میں مسلم لیگ کی عوامی مقبولیت کے لئے قابل عمل تجاویز پیش کرنا ـــــ ۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء کو انہوں نے جو مکتوب قائداعظم کو بھیجا اسے انہوں نے نہایت خفیہ قرار دیا۔ اس میں انہوں نے لکھا :

"میری تجویز ہے ـــــ کہ آپ دہلی میں فوراً آل انڈیا کنونشن کا انعقاد کریں' جس میں تمام صوبائی اسمبلیوں کے نو منتخب ارکان اور دیگر اہم مسلمان لیڈروں کو مدعو کریں۔ اس کنونشن میں آپ پوری قوت سے اور واشگاف طور پر ہندوستانی مسلمانوں کا سیاسی نصب العین واضح کر دیں کہ وہ ملک میں ایک جداگانہ سیاسی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندوستان اور بیرون ہند یہ بتلانا بھی نہایت ضروری ہے کہ ہندوستان کو محض اقتصادی مسئلہ ہی درپیش نہیں ہے' ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اسلامی نقطہ نظر سے تہذیبی ورثے کا مسئلہ بھی بہت اہم ہے ـــــ اگر آپ اس نوع کا کنونشن منعقد کریں تو پھر

ایسے مسلم اراکین اسمبلی کی نیتوں کا پتہ بھی چل جائے گا جنہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی خواہشات اور مقاصد کے خلاف جماعتیں بنا رکھی ہیں۔"(۲۱)

۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو انہوں نے جو کچھ لکھا وہ پاکستان کے سیاسی' معاشی اور تمدنی نظام کی تشکیل سے متعلق ان کے اہم ترین تصورات پر مبنی ہے۔ ملاحظہ کیجئے :

"لیگ کو بالآخر یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ وہ مسلمانوں کے محض اعلیٰ طبقے کی نمائندہ بنی رہے یا عام مسلمانوں کی نمائندگی کرے' جواب تک معقول وجوہ کی بناء پر اس میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ کوئی سیاسی جماعت جب تک عام مسلمانوں کی حالت کو بہتر بنانے کا وعدہ نہ کرے' وہ اس وقت تک عوام کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی۔"

نئے آئین (۱۹۳۵) میں بڑی بڑی اسامیاں تو اعلیٰ طبقے کے بچوں کے لئے وقف ہیں اور جو چھوٹی ملازمتیں ہیں وہ وزراء کے دوستوں اور رشتہ داروں کی نذر ہو جاتی ہیں۔ دوسرے امور میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے عام مسلمان کی حالت بہتر بنانے کے باب میں سوچا ہی نہیں۔ روٹی کا مسئلہ روز بروز ٹیڑھا ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمانوں میں یہ احساس بڑھتا جا رہا ہے کہ گزشتہ دو سو سال میں وہ برابر تنزل کی طرف جا رہے ہیں۔ عام طور سے وہ (مسلمان) سمجھتے ہیں کہ ہندو کی سودخوری اور سرمایہ داری اس کی غربت کے ذمہ دار ہیں' لیکن یہ احساس کہ غیر ملکی حکومت بھی ان کے افلاس کی ذمہ دار ہے' ابھی عام مسلمان کے ذہن میں پیدا نہیں ہوا۔ مگر یہ احساس ضرور پیدا ہو کر رہے گا۔۔۔۔۔۔ اگر لیگ نے اس سلسلے میں کوئی امید افزا قدم نہ اٹھایا تو مجھے یقین ہے کہ مسلمان عوام پہلے کی مانند لیگ سے لاتعلق رہیں گے۔۔۔۔۔۔ اس ملک میں جب تک ایک آزاد مسلم ریاست یا ریاستیں معرضِ وجود میں نہ

آئین، اسلامی شریعت کا نفاذ ممکن نہیں۔ سال ہا سال سے میرا یہی عقیدہ رہا ہے اور میں اب بھی اسی کو مسلمانوں کی روٹی کے مسئلے اور ہندوستان کے امن و امان کا بہترین حل سمجھتا ہوں۔۔۔۔۔
اگر ہندومت نے معاشرتی جمہوریت (سوشل ڈیماکریسی) کو قبول کر لیا تو خود ہندو دھرم ہی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اسلام کے لئے سوشل ڈیماکریسی کا کسی موزوں شکل میں اور شریعت کے مطابق قبول کرنا کوئی نئی بات یا انقلاب نہیں، بلکہ ایسا کرنا اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف لوٹنا ہوگا۔ مسائل حاضرہ کا حل مسلمانوں کے لئے ہندوؤں سے کہیں زیادہ آسان ہے۔۔۔۔۔ مسلم ہند کے ان مسائل کا حل اسی وقت ممکن ہو سکے گا جب کہ ملک کی از سر نو تقسیم کی جائے اور ایک یا زائد مسلم ریاستیں جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہو، وجود میں لائی جائیں۔ کیا آپ کے خیال میں اس مطالبے کا وقت نہیں آن پہنچا۔" (۱۷)

۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو اپنے ایک اور مکتوب میں علامہ اقبال نے قائداعظم کو لکھا:

"اس وقت جبکہ شمال مغربی ہندوستان بلکہ تمام ہندوستان میں جو طوفان بڑھتا آ رہا ہے، ہندوستانی مسلمان صرف آپ ہی سے رہنمائی کی امید رکھتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ آئین (۱۹۳۵) محض ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ ہندو اکثریتی صوبوں میں ہندوؤں کو قطعی اکثریت حاصل ہے اور وہاں وہ مسلمانوں کو بالکل نظرانداز کر سکتے ہیں مگر مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی مسلمانوں کو ہندوؤں کا دست نگر بنا دیا گیا ہے۔۔۔۔۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ ہندوستان میں امن قائم رکھنے کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ اس کو نسلی، مذہبی اور لسانی اشتراک کی بناء پر از سر نو تقسیم کر دیا جائے۔۔۔۔۔ ہندوستان میں امن و امان قائم کرنے

اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے تسلط سے بچانے کی واحد ترکیب یہی ہے. جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ مسلم صوبوں کی علیحدہ فیڈریشن قائم کی جائے۔ کیا وجہ ہے کہ شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو علیحدہ قوم تصور نہ کیا جائے اور جنہیں حق خود اختیاری حاصل ہو۔"(۱۸)

۷ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو پھر انہوں نے ایک "پرائیویٹ اور خفیہ" مکتوب میں قائداعظم کو لکھا :

"مسئلہ فلسطین مسلمانوں کے ذہن میں بہت اضطراب پیدا کر رہا ہے۔۔۔۔۔ ذاتی طور پر میں کسی ایسے امر کی خاطر جیل جانے کو بھی تیار ہوں، جس سے اسلام اور ہندوستان متاثر ہوتے ہیں، مشرق کے دروازے پر مغرب کا ایک اڈہ بننا اسلام اور ہندوستان دونوں کے لئے پر خطر ہے۔"(۱۹)

ان مکاتیب کی اہمیت اس تناظر میں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ علامہ اقبال نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں لکھے، جب ان کی بینائی تقریباً جواب دے چکی تھی اور بعض مکاتیب انہوں نے دوسروں سے لکھوائے اور انہیں پیچیدہ جسمانی عوارض نے گھیر رکھا تھا، مگر وہ پنجاب میں یونینسٹوں کی سازشوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ پنجاب مسلم لیگ کے رابطہ عوام کے لئے عملی پروگرام بنا رہے تھے۔ مسلمانان برصغیر کی سیاسی اور تہذیبی شناخت کے لئے بامعنی جدوجہد کے آخری مرحلے میں قائداعظم کی قیادت پر پرزور اعتماد کا اظہار کر رہے تھے اور عالم اسلام کے بنیادی مسائل پر بھی سیاسی موقف کو مسلمانان برصغیر کی تحریک آزادی کا حصہ بنانے پر اصرار کر رہے تھے۔۔۔۔۔

د) دونوں زعماء کی باہمی رائے

علامہ اقبال، قائداعظم کی استقامت، دیانت اور سیاسی شعور سے بے حد متاثر تھے۔ (ابتدائی اختلافات کے باوجود) اور عمر کے آخری ایام میں کھل کر اس موقف کا اظہار کرتے رہے کہ مسلمانان برصغیر کی سیاسی جدوجہد صرف ایک قائد کی قیادت میں

نتیجہ خیز ہو سکتی ہے اور وہ ہیں محمد علی جناح۔ ایک مرتبہ فرمایا :

"مسٹر جناح کو اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی خوبی عطا کی ہے جو آج تک ہندوستان کے کسی مسلمان میں مجھے نظر نہیں آتی۔ حاضرین میں سے کسی نے پوچھا کہ وہ خوبی کیا ہے تو فرمایا

He is incorruptible and unpurchaseable (ان کی دیانت کو لغزش نہیں اور کوئی ان کا سودا نہیں کر سکتا)

اسی طرح ۱۹۳۶ء۔۱۹۳۷ء کے انتخابات کے موقع پر پنڈت نہرو نے قائداعظم کی طبقاتی حیثیت اور مسلمانوں کی قیادت کے استحقاق کو نشانہ تنقید بنایا تو علامہ اقبال نے ایک تفصیلی بیان جاری کیا جو "سول اینڈ ملٹری گزٹ" اور "نیو ٹائمز" میں شائع ہوا۔ اس میں انہوں نے کہا :

"مسٹر جناح آج مسلمانوں کے سب سے بڑے اور سب سے معتمد علیہ لیڈر ہیں۔ انہوں نے اپنے ملک کی جو خدمت کی ہے' وہ کسی اور لیڈر سے کم نہیں' لیکن مسٹر جناح تخیل کی دنیا میں پرواز کرنے کی بجائے حقیقت بینی کو ترجیح دیتے ہیں۔

(اسی تناظر میں علامہ اقبال کے اس فقرے کو بھی دیکھئے جب انہوں نے دوران گفتگو پنڈت نہرو سے کہا تھا :

(Jinnah is a Politician, you are a Patriot.)

اسی لئے ان کی قوم پرستی اور حب الوطنی حقائق و واقعات کے صحیح تجزیے پر مبنی ہے ــــــ مسلمانوں کی طرف سے اگر کسی شخص کو بات کرنے کا حق حاصل ہے تو وہ صرف مسٹر جناح ہیں۔" (۲۱)

اسی طرح ایک ملاقات میں جب میاں افتخار الدین نے اقبال کو مشورہ دیا کہ مسلمان مسٹر جناح سے زیادہ آپ کی عزت کرتے ہیں۔ اگر آپ مسلمانوں کی طرف سے کانگریس کے ساتھ بات چیت کریں تو نتیجہ بہتر نکلے گا' تو علامہ اقبال نے واضح انداز میں

کہا "میں آپ کو بتلا دینا چاہتا ہوں کہ مسٹر جناح ہی مسلمانوں کے اصل لیڈر ہیں۔ میں تو ان کا ایک معمولی سپاہی ہوں۔" (۲۲)

یونینسٹ پارٹی کے ترجمان اخبار "انقلاب" کے مدیروں غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک سے ایک ملاقات میں برملا کہا :

"ہمارے مسائل کا حل صرف ایک ہے' یونینسٹ پارٹی توڑ دی جائے۔۔۔۔۔ مسلمانوں کی زمام قیادت صرف لیگ کے ہاتھ میں ہو' ہمیں جناح سے بہتر کوئی آدمی نہیں مل سکتا' جناح ہی ہماری قیادت کے اہل ہیں۔" (۲۳)

یہ محبت یک طرفہ نہیں تھی۔ قائداعظم بھی مسلمانوں میں علامہ اقبال کی مقبولیت' بے غرض سیاست اور تفکر کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ علامہ اقبال کے مکتوبات "قائداعظم کے نام" کے دیباچے میں قائداعظم نے لکھا : "ان کے خیالات مجموعی طور پر میرے تصورات سے ہم آہنگ تھے۔ ہندوستان کو جو آئینی مسائل درپیش تھے' ان کے گہرے مطالعہ اور غور و خوض کے بعد میں بھی آخر کار ان ہی نتائج تک پہنچا' جن تک سر اقبال پہلے ہی پہنچ چکے تھے اور یہ خیالات وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانان ہند کے متحدہ عزم کی شکل میں ظاہر ہوئے اور آل انڈیا مسلم لیگ کو اس قرارداد کی صورت میں ڈھل گئے' جو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو منظور ہوئی اور جسے اب "قرارداد پاکستان" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔"

شاہد حسین رزاقی کی کتاب "اقبال اور سیاست" (۱۹۴۱) کے دیباچے میں قائداعظم نے لکھا :

"Every great movement has a philosopher and Iqbal was the philosopher of the National Renaissance of Muslim India." (۲۵)

(ہر عظیم تحریک کسی مفکر کی مرہون منت ہوتی ہے اور مسلمانان ہند کی قومی نشاۃ الثانیہ کے مفکر اقبال ہیں)

حوالہ جات

۱۔ "اقبال اینڈ جناح پرسنالیٹز" پر سپشن اینڈ ہالیکس" از سلیم قریشی، اقبال، جناح اینڈ پاکستان (انگریزی) مرتب سی ایم نعیم دین گارڈ لاہور ۸۴، ص ۱۱۔۲۰

۲۔ "اقبال کے آخری دو سال" ص ۲۱۱

۳۔ ایضاً ص ۲۱۲

۴۔ ایضاً ص ۲۱۸

۵۔ "اقبال اور قائداعظم" ص ۲۱

۶۔ ایضاً ص ۱۹

۷۔ ایضاً ص ۲۳

۹۔ "اقبال کے آخری دو سال" ص ۲۳۰

۱۰۔ اقبال اور قائداعظم، ص ۳۹

۱۱۔ ایضاً ص ۳۲

۱۲۔ "گفتار اقبال" از رفیق افضل ص ۱۰۸

۱۳۔ "اقبال کے آخری دو سال" ص ۶۰۶

۱۴۔ "فاؤنڈیشنز آف پاکستان" از شریف الدین پیرزادہ ص ۲۶۳

۱۵۔ "اقبال کے آخری دو سال" ص ۳۱۳

۱۶۔ "اقبال اور قائداعظم" ص ۱۰۳

۱۷۔ ایضاً ص ۱۰۶۔۱۰۷

۱۸۔ ایضاً ص ۱۰۸۔۱۱۱

۱۹۔ ایضاً ص ۱۱۳

۲۰۔ ایضاً ص ۸۲۔۸۳

۲۱۔ "اقبال کے آخری دو سال" ص ۳۸۳۔۳۸۶

۲۲۔ ایضاً ص ۵۴۴

۲۳۔ "اقبال کے حضور" از سید نذیر نیازی کراچی ۷۱، ص ۳۹۴

۲۴۔ اقبال کے خطوط، جناح کے نام، مرتب محمد جہانگیر عالم، جھنگ ۸۳ ص ۳۵۔۳۶

۲۵۔ بحوالہ "اقبال اور قائداعظم" ص ۹۴

باب پنجم

قرارداد پاکستان سے تشکیل پاکستان تک

الف) قرارداد پاکستان ۱۹۴۰ء

ب) دوسری جنگ عظیم کے دوران ہندوستان کی سیاسی ' سماجی صورت حال

ج) ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات

د) کیبنٹ مشن

ھ) یوم راست اقدام اور مسلم لیگ کی عبوری حکومت میں شمولیت

و) ۳ جون ۴۷ کا تقسیم ہند کا منصوبہ اور قیام پاکستان

ز) ریڈ کلف ایوارڈ

ح) ہندو مسلم اور سکھ مسلم فسادات

ط) تحریک پاکستان ۔ چند سوالات ' چند حقائق

الف) قرارداد پاکستان ۱۹۴۰ء

علامہ اقبال کی آخری خواہش کی تکمیل ان کی وفات کے بعد اس وقت ہوئی‘ جب لاہور کے منٹو پارک میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا ۲۷واں سالانہ اجلاس منعقد ہوا اور اس اجلاس میں وہ تاریخی قرارداد پیش اور منظور ہوئی جسے ”قرار داد پاکستان“ کہتے ہیں۔ یہ قرار داد بنگال کے وزیرِاعلیٰ مولوی اے۔کے فضل الحق نے پیش کی۔ یو پی کے رکن اسمبلی چودھری خلیق الزمان نے تائید کی‘ جبکہ مولانا ظفر علی خان‘ سردار اورنگ زیب خان‘ حاجی عبداللہ ہارون‘ نواب اسمٰعیل خان‘ قاضی محمد عیسیٰ‘ عبدالحمید خان‘ آئی آئی چندریگر‘ سید عبدالروٴف شاہ‘ ڈاکٹر محمد عالم‘ سید ذاکر علی‘ محترمہ بیگم محمد علی جوہر اور مولانا عبدالحمید قادری نے قرارداد کے حق میں تقاریر کیں۔(۱)

قرارداد میں کہا گیا تھا: ”یہ اجلاس شدت سے مصر ہے کہ انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی وفاقی سکیم اس ملک کے مخصوص حالات کے تحت نامناسب اور ناقابل عمل ہے اور مسلم ہند کے لئے ناقابل قبول ہے۔۔۔۔۔۔ درحقیقت اس ملک میں کوئی آئینی منصوبہ اس وقت تک قابل عمل یا مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہ ہوگا جب تک اس میں ان بنیادی اصولوں کا خیال نہ رکھا جائے۔۔۔۔۔ جغرافیائی اعتبار سے متصل اکائیوں کو اس طرح ایسے علاقوں میں ضروری علاقائی ردوبدل کے ساتھ‘ متعین کیا جائے کہ وہ علاقے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں جیسے ہندوستان کے شمال مغرب اور مشرق میں‘ ان کو اس طرح مجتمع کیا جائے کہ ایسی آزاد ریاستیں وجود میں آجائیں جن میں سے ہر ایک خود مختار اور مقتدر ہو۔“(۲) اس قرارداد میں ”ضروری علاقائی ردوبدل“ کے الفاظ کی شمولیت سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ مسلم لیگ نے دو مسلم اکثریتی صوبوں بنگال اور پنجاب کو تقسیم کرنا قبول کر لیا تھا (چودھری خلیق الزمان نے اپنی کتاب Pathway To India میں ان الفاظ کی شمولیت پر کڑی تنقید کی ہے)‘ اس کے علاوہ شمال مغرب اور مشرق کے مسلم اکثریتی علاقے پر مشتمل ایک مقتدر ریاست نہیں‘ خودمختار ریاستوں کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ آنے والے دنوں میں مسلم بنگال میں اٹھنے والی علیحدگی کی تحریکوں نے انہی الفاظ کا جذباتی اور قانونی سہارا لیا۔ (یہ امر معنی خیز ہے کہ علامہ اقبال کے خطبہ الہ آباد اور چودھری رحمت علی کی سکیم بلکہ ان کے تجویز کردہ نام

"پاکستان" کے اجزائے ترکیبی کے سلسلے میں مسلم بنگال کو نظرانداز کر دیا گیا تھا)

ب) دوسری جنگ عظیم کے دوران ہندوستان کی سیاسی اور سماجی صورت حال

شاہ انگلستان نے ۱۹۴۱ء میں وزیر اعظم انگلستان سے اپنی گفتگو کو ڈائری میں یوں درج کیا: "اس نے (چرچل نے) یہ کہہ کر مجھے ششدر کر دیا کہ اس کے رفقاء اور پارلیمنٹ کی دونوں یا تینوں کی تینوں پارٹیاں بالکل تیار ہیں کہ جنگ کے بعد ہندوستان کو ہندوستانیوں کے حوالے کر دیا جائے۔" (۳) یہ صورت حال راتوں رات پیدا نہیں ہوئی بلکہ دو عالمی جنگوں نے برطانیہ عظمیٰ کو رفتہ رفتہ کاغذی شیر ثابت کر دیا' عالمی افق پر امریکہ اور روس دو بڑی طاقتوں کے طور پر ابھرے' جنہیں کم از کم اس وقت استعمار سے دلچسپی نہیں تھی' اس کے علاوہ نو آبادیوں میں ایسا تعلیم یافتہ اور قوم پرست طبقہ پروان چڑھ چکا تھا جو جانتا تھا کہ استعماری حکومتوں کی جنگ ان کے اپنے مفادات کے تابع ہے۔ ظاہر ہے کہ غلاموں کو کسی اور بیرونی قوت کی غلامی سے خوف زدہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی ان سے حقائق چھپائے جا سکتے تھے۔ ہندوستانی بخوبی جانتے تھے کہ ان کے وطن کو اتحادیوں نے جنوب مشرقی ایشیا کمان کے لئے رسد گاہ بنا دیا تھا۔ امریکہ' برطانیہ اور ہند کی کرائے کی افواج کو ضروریات اور سازوسامان کی فراہمی اسی رسد گاہ کے ذمے تھی' یہی نہیں بلکہ ۲۵ لاکھ فوجیوں کی تنخواہ بھی ہندوستانی خزانے سے ادا کی جاتی تھی اور جب ۱۹۴۲ء میں امریکی افواج ہند میں متعین ہوئیں تو ان کی ضروریات بھی ہند کی طرف سے معکوس ادھار پٹہ (ریورس لینڈ لیز) کی اساس پر پوری کی جاتی تھیں۔ (۴) اس کے علاوہ جہازوں کی نایابی' درآمدات میں تخفیف' محاذ کے لئے افواج اور جنگی سازوسامان کی بھاری نقل و حمل سے نظام مواصلات میں خلل اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مساعی جنگ کے لئے تخلیق زر۔۔۔۔۔ ان سب اسباب کا مجموعی نتیجہ یہ نکلا کہ قیمتوں میں تیزی سے اضافہ ہوا اور افراط زر کا دباؤ سنگین صورت اختیار کر گیا۔ سب سے زیادہ مصیبت بنگال نے اٹھائی جہاں ۱۹۴۳ء میں قحط پڑا۔ سرکاری طور پر اعتراف کیا گیا کہ ۱۸ لاکھ ۳۷ ہزار ۷ سو ۴۹ افراد فاقہ کشی سے مرے۔ (۵) برطانوی حکومت اور اس کے کمان دار ہندوستانیوں کو کفن سے بھی

جس طرح محروم کرنا چاہتے تھے ان کی بھوک کو جتنا بے وقعت جانتے تھے اور اس حالت میں بھی انہیں دھوکہ دینے سے نہیں چوکتے تھے' اسے لارڈ ویول بھی نہیں چھپا سکے:

(الف) "ماؤنٹ بیٹن پیراشوٹ کمانڈ کے لئے اپنی دانست میں صرف دو فیصدی ہندوستانیوں کو کپڑے سے محروم کرنا چاہتے تھے مگر میں (لارڈ ویول) نے انہیں بتایا کہ ہندوستان کی دو فیصدی آبادی سے مراد اسی لاکھ افراد ہیں۔"(٦) (ب) "سیکرٹری آف سٹیٹ کی خواہش ہے کہ میں یہاں سے ڈیڑھ لاکھ ٹن چاول تو بھجوا دوں' البتہ ڈیڑھ لاکھ ٹن گندم کی درآمد کا محض اعلان کر دوں۔"(٧) (ج) "مجھ پر ظاہر ہو گیا کہ یونانی اور دیگر آزاد اقوام کو (غلام) ہندوستان کے مقابلے پر قحط سے بچانا ضروری سمجھا جا رہا ہے۔"(٨) حالانکہ "جنگ کے ابتدائی دو برسوں میں ہندوستان نے مشرق وسطی میں ہمیں بچایا' چہ جائیکہ ہم اس کا دفاع کرتے۔"(٩)

چنانچہ ہندوستانی عوام کی دلجوئی کے لئے ۱۹۴۲ء کے اوائل میں کرپس مشن ہندوستان پہنچا' مگر اس کے وعدے مسلم لیگ خصوصاً کانگریس اور گاندھی جی کو مطمئن نہ کر سکے۔ گاندھی جی نے کرپس مشن کی پیشکش کے بارے میں یہ تاریخی جملہ کہا: "یہ ایک دیوالیہ بینک کا بعد کی تاریخ کا چیک ہے۔"(١٠) گویا سبزی خور سر سٹیفورڈ کرپس بھی مہاتما کو مطمئن نہ کر سکا تھا۔ دراصل کانگریسی قیادت کو جاپان کی ابتدائی فتوحات نے یہ نتیجہ اخذ کرنے پر آمادہ کیا تھا کہ اس جنگ میں برطانیہ کی ہار یقینی ہے' چنانچہ کرپس مشن کے فوراً بعد گاندھی نے ہندوستان چھوڑ دو (Quit India) کی تحریک شروع کر دی۔ گاندھی جو اس سے پہلے نمک بنانے کی تحریک' ترک موالات' تحریک خلافت وغیرہ میں سیہ گرہ کر چکے تھے' ایک مرتبہ پھر میدان میں اترے۔ کولن کراس نے کہا ہے: "اگر کسی ایک شخص نے برطانوی سلطنت کے زوال میں نمایاں کردار ادا کیا تو وہ گاندھی ہے۔"(١١) کرپس مشن کی ناکامی نے صدر امریکہ روز ویلٹ کو اتنا مضطرب کیا کہ انہوں نے ۲۲ اپریل ۱۹۴۲ء کو برطانوی حکومت کے نام ایک تار میں زور دیا کہ ہندوستانی مسائل کے حل کے لئے ایک اور کوشش کی جائے۔(١٢)

Quit India کے مطالبے کا جواب قائداعظم نے اس مطالبے سے دیا Divide and Quit اور مسلمانوں کو ہدایت کی کہ وہ گاندھی کی تحریک سے الگ

تعلق رہیں، جو برطانیہ کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے بھی خلاف ہے۔

۱۹۴۴ء میں جیل سے رہا ہونے کے بعد گاندھی نے قائداعظم سے پہلے خط و کتابت اور پھر ملاقات کی۔ ملاقات کی بنیاد "سی راج گوپال اچاریہ فارمولا" بنا، جس کے مطابق انگریزوں کے چلے جانے اور مسلم اکثریتی صوبوں کے عوام کی مرضی معلوم کرنے کے بعد پاکستان کے قیام کا وعدہ کیا گیا تھا، مگر قائداعظم نے گاندھی پر واضح کر دیا کہ پاکستان کا نام ان کے ہونٹوں پر تو ہے مگر دل میں نہیں۔ اس لئے یہ بات چیت ناکام رہی۔۔۔۔۔

جنگ کے دوران میں ہی کانگریس کے ایک سابقہ صدر نیتا جی سبھاش چندر بوس جیل سے فرار ہو کر جاپان پہنچے۔ وہاں انہوں نے ہندوستانی اسیران جنگ پر مشتمل آزاد ہند فوج تشکیل دی جس سے برطانیہ کو بہت پریشانی ہوئی۔ جنگ کے خاتمے پر آزاد ہند فوج کے ارکان پر مقدمے چلائے گئے جس سے تحریک آزادی کو اور بھی تقویت ملی۔ جنگ کے اختتام کے قریب لارڈ ویول نے متحدہ ہندوستان کو حکومت میں نمائندگی دینے کی خاطر ہندوستانی رہنماؤں کا ایک اجلاس شملہ میں بلایا جو ۱۴ جولائی ۱۹۴۵ء کو منعقد ہوا، جو کانگریسی رہنماؤں کی ہٹ دھرمی اور قائداعظم کی اپنے موقف پر استقامت کے سبب ناکام رہا۔۔۔۔۔

مسلم لیگ کو گزشتہ عام انتخابات میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی تھی، تاہم ۱۹۳۷ء کے بعد سے مسلم لیگ نے تقریباً ہر ضمنی انتخاب میں مسلم نشست جیتی۔ سندھ اور بنگال میں مسلم لیگ وزارت قائم تھی، پنجاب میں دوہری وفاداری رکھنے والے مسلمان یونینسٹ برسراقتدار تھے۔ بہرطور وائسرائے نے مناسب یہ سمجھا کہ بدلی ہوئی صورت حال میں ہندوستانی جماعتوں کی مقبولیت آزمانے کے لئے نئے عام انتخابات منعقد کرائے جائیں۔

(چ) ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات

۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں مسلمانوں نے ثابت کر دیا کہ ان کے مفادات اور امنگوں کی حقیقی ترجمان جماعت مسلم لیگ ہی ہے۔ مسلم لیگ نے گیارہ صوبوں میں

۴۹۵ مخصوص نشستوں میں سے ۴۴۰ نشستیں حاصل کیں۔ اگر مرکزی اسمبلی کی چودہ نشستوں کو منہا کر دیا جائے تو مسلم لیگ نے صوبائی اسمبلیوں کے لئے ۴۲۶ نشستیں حاصل کیں۔ ان میں ۴۹ نشستیں ایسی تھیں جو مسلم لیگ نے بلامقابلہ حاصل کیں، جبکہ کانگریس نے ۱۵۸۵ صوبائی نشستوں میں سے ۹۰۵ نشستیں حاصل کیں، جن میں ۳۲۴ اس نے بلامقابلہ حاصل کیں۔(۱۳) ان نتائج نے حکمرانوں پر بھی واضح کر دیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی حقیقی نمائندہ جماعت مسلم لیگ ہی ہے۔ کانگریسی رہنماؤں کو بھی پتہ چل گیا کہ اب تحریک پاکستان ان کے روکے نہیں رک سکتی۔

د) کیبنٹ مشن ۱۹۴۶ء

وزیراعظم انگلستان مسٹر ایٹلی نے فروری ۱۹۴۶ء میں دارالعوام میں اعلان کیا کہ لارڈ پیتھک لارنس، سر سٹیفورڈ کرپس اور اے وی الیگزینڈر پر مشتمل ایک کیبنٹ وفد ہندوستان کے مستقبل کے آئین کی تیاری اور دیگر اقدامات کے لئے وہاں کے لیڈروں سے بات چیت کرے گا۔ یہ وفد ۲۴ مارچ کو ہندوستان پہنچا۔ یہ وفد کس حد تک غیر جانبدار تھا؟ اس سلسلے میں لارڈ ویول کی شہادت ہی کافی ہے:

۱۔ "مجھے پتہ چلا کہ یہاں آنے سے پہلے مشن کے مقاصد کے بارے میں کرپس، نہرو سے ذاتی خط و کتابت کرتا رہا۔"(۱۴)

۲۔ "میں کرپس کو تو جانبدار سمجھتا ہوں۔"(۱۵)

اسی طرح وفد کے ایک رکن الیگزینڈر، فرینڈز ایمبولینس یونٹ کے رکن تھے، جو کانگریس کے ساتھ مل کر ہندوستان میں امدادی کاروائیاں کرتی رہی تھی۔ لارڈ ویول نے لکھا کہ اس کے ارکان کانگریسی کیمپ میں رہتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ روزانہ لارڈ پیتھک لارنس سے بھی ملاقاتیں کرتے تھے۔ ایک اور موقع پر ویول نے بڑی ناگواری سے لکھا ہے کہ ایک ملاقات میں گاندھی نے پانی مانگا، کرپس خود بھاگا ہوا گیا، اسے دیر ہوئی تو سیکرٹری آف سٹیٹ پیتھک لارنس خود پانی لینے چلا گیا۔(۱۶) اس پس منظر میں مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ دعویٰ خلاف قیاس معلوم نہیں ہوتا کہ کیبنٹ مشن کا فارمولا انہی کی تجاویز پر مبنی تھا۔ (India Wins Freedom) بہرطور ۱۶ مئی ۱۹۴۶ کو اس

فارمولے کا اعلان کیا گیا' جس کے مطابق ہندوستان کو تین گروپوں میں تقسیم کیا جانا تھا۔ پہلا گروپ ہندو اکثریتی علاقے پر مشتمل ہو' جب کہ دوسرا اور تیسرا مسلم اکثریتی علاقوں پر۔۔۔۔۔ مرکز کے پاس دفاع' امور خارجہ' مواصلات' کرنسی اور تجارت کے اختیارات ہوں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وفاق ہند کا آئین بن جانے کے دس برس بعد ہر گروپ کو اپنے نمائندوں کی اکثریت کی رضامندی کے ساتھ وفاق سے الگ ہو جانے کا حق ہو۔۔۔۔۔ اس اعلان میں عبوری حکومت تشکیل دیئے جانے کا منصوبہ بھی شامل تھا۔۔۔۔۔ کانگریس نے بعض تحفظات کے ساتھ اسے قبول کر لیا۔ مسلم لیگ اور قائداعظم نے بھی اس سکیم کو قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔۔۔۔۔ مسلم لیگ کا دعویٰ یہ تھا کہ اس نے مشن کی تجویز اس لئے قبول کی ہے کہ اس طرح ہندوستان کے آئینی مسائل تسلی بخش طور پر حل ہو سکیں گے' لیکن جناح کو اس بات پر اصرار تھا کہ مشن کا منصوبہ انہوں نے محض حصول پاکستان کا ایک ذریعہ سمجھ کر قبول کیا تھا۔(۱۷)

قائداعظم کیبنٹ مشن کے ارکان اور کانگریسی رہنماؤں کے غیر سرکاری رابطوں سے غافل نہ تھے اور نہ ہی وہ کانگریسی رہنماؤں کی دوہری زبان سے ناآشنا تھے۔۔۔۔۔ جواہرلال نہرو نے جو ابوالکلام آزاد کی بجائے کانگریس کے صدر بن چکے تھے' ۱۰ جولائی ۱۹۴۶ء کو اپنے عزائم ایک پریس کانفرنس میں ظاہر کر دیئے(۱۸)' جس میں انہوں نے دعویٰ کیا کہ ہم دستور ساز اسمبلی کے ذریعے اس سکیم میں حسب منشاء ترمیم کر سکیں گے اور جو علاقہ کسی بھی مجوزہ گروپ میں شامل نہیں ہونا چاہے گا' اس کی مرضی کے بغیر اسے اس شرکت پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ نہرو کے دوست اور رفیق کار ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے: "یہ بدنصیبی کے حادثات میں سے ایسا بڑا واقعہ ہے جس نے تاریخ کی راہ بدل دی۔"(۱۹) ادھر لارڈ ویول اپنے اس اعلان کو عملی جامہ پہنانے سے ہچکچا رہے تھے' جس کے مطابق کانگریس کے انکار کے بعد صرف مسلم لیگ کو عبوری حکومت میں شمولیت کا استحقاق ملتا تھا' چنانچہ قائداعظم نے مسلم لیگ کونسل کا فوری اجلاس طلب کر کے کیبنٹ مشن کی تجاویز کی منظوری کو واپس لینے کا اعلان کیا۔ برطانوی حکومت پر کڑی تنقید کی اور ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو یوم راست اقدام منانے کا فیصلہ کیا۔

ھ) یوم راست اقدام اور مسلم لیگ کی عبوری حکومت میں شمولیت

۲۷، ۲۸ اور ۲۹ جولائی ۱۹۴۶ء کو قائداعظم کی صدارت میں مسلم لیگ کونسل کا ایک اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا، جس میں کانگریس کی چالبازیوں اور برطانوی حکومت کی ہندو نواز پالیسیوں کی مذمت کی گئی۔ کیبنٹ مشن کے منصوبے کی منظوری کا اعلان واپس لیا گیا۔ اپریل ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کونسل کی طرف سے منظور شدہ قرارداد (ایک خودمختار پاکستان کے قیام کے مطالبے پر مبنی) پر زور دینے کا اعلان کیا گیا اور یہ بھی طے کیا گیا کہ برطانوی اعزازات بطور احتجاج واپس کردیے جائیں۔ ساتھ ہی ساتھ ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو یوم راست اقدام کے طور پر منایا جائے۔ قائداعظم نے اپنے مزاج سے بالکل ہٹ کر تقریر کی اور کہا : "آج سے ہم آئینی طریقوں کو خیرباد کہتے ہیں۔۔۔۔۔ کیبنٹ مشن اور وائسرائے سے گفتگو کے دوران میں مسلسل دونوں دوسرے فریقوں یعنی برطانیہ اور کانگریس نے اپنے ہاتھ میں ایک پستول تھامے رکھا، ایک نے تو اقتدار اور اسلحہ کا اور دوسرے نے عام جدوجہد اور عدم تعاون کا۔ آج ہم نے بھی ایک پستول بنا لیا ہے اور ہم اسے استعمال کرنے پر قدرت بھی رکھتے ہیں۔(۲۰) اس اجلاس کا سب سے غیر معمولی منظر وہ تھا جب خطاب یافتہ ارکان ایک ایک کرکے ڈائس پر جاتے اور اپنے خطاب واپس کرنے کا اعلان کرتے، چنانچہ کانگریس نواز ہفت روزہ "بلٹز" بمبئی کو بھی لکھنا پڑا : "گزشتہ ہفتے لیگ کی جو زبردست قلب ماہیت عمل میں آئی یعنی جس طرح وہ مسلمان نوابوں، نونوں اور نائٹوں کے ایک رجعت پسند گٹھ جوڑ سے ایک ایسی انقلاب پسند تنظیم میں تبدیل ہوگئی جو اگر عملاً نہیں تو کم از کم قولاً شہنشاہیت کے خلاف جدوجہد کرنے میں منہمک ہے۔"(۲۱) اس جوش و خروش کے نتیجے میں کلکتہ میں ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو خونریز ہندو مسلم فسادات ہوئے اور بعض تخمینوں کے مطابق ہلاک ہونے والوں کی تعداد بیس ہزار تھی۔(۲۲) تقریباً ہر غیر ملکی یا قوم پرست مورخ نے ان فسادات کی ذمہ داری بنگال کے مسلم وزیراعلیٰ حسین شہید سہروردی پر ڈالی ہے، جنھوں نے ۱۶ اگست ۴۶ء کو عام تعطیل کا اعلان کردیا تھا۔ مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر عام تعطیل کرنے سے ہی یہ ہولناک ہنگامہ ہوا تو پھر سندھ میں ایسا کیوں نہ ہوا کہ وہاں بھی مسلم لیگی حکومت نے

تعطیل کا اعلان کیا تھا۔۔۔۔۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اس واقعہ کو ہندوستانی تاریخ کے عظیم ترین المیوں میں سے ایک قرار دیا ہے۔(۲۳) اور بلاشبہ انسانی ہلاکت بجائے خود افسوسناک ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس سانحہ نے ایک طرف خود انگریزوں کو ہلا کے رکھ دیا' جنہیں اپنی انتظامیہ اور افواج کا زعم تھا اور دوسری طرف کانگریسی قیادت کو مسلم لیگ کی قانون شکن اور پر تشدد قوت کا اندازہ بھی ہو گیا۔ ادھر لارڈ ویول نے ستمبر ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کے بغیر ہی جو عبوری حکومت بنالی تھی' انہیں ایک ماہ بعد ہی مسلم لیگ کو اس میں شامل کرنا پڑا۔ کانگریسی قیادت نے اپنی دانست میں مسلمانوں کو غیر اہم وزارتیں دیں (یا ان کا خیال تھا کہ ان وزارتوں کا کام مسلمانوں کے بس کا نہیں) ان میں وزارت خزانہ بھی تھی' مگر جب لیاقت علی خان نے عوام کا بجٹ پیش کیا اور سرمایہ داروں پر ٹیکس لگایا تو کانگریس کو خطیر چندے دینے والے سرمایہ دار چلا اٹھے' جس پر بہت سے کانگریسی رہنما مسلم لیگ سے چھٹکارا پانے کی سبیل ڈھونڈنے لگے۔(۲۴)

و) ۳ جون ۱۹۴۷ء کا تقسیم ہند کا منصوبہ اور قیام پاکستان

جنگ عظیم دوم کے نتائج' دوسری بڑی طاقتوں کے دباؤ' ہندوستان میں بڑھتی ہوئی مزاحمت اور سب سے بڑھ کر ایسی رپورٹیں کہ برطانوی ہند کی افواج کا نظم و ضبط کسی بھی وقت ختم ہو سکتا ہے۔(۱۹۴۶ء میں بحریہ کی بغاوت نے ان رپورٹوں کی تصدیق کر دی) برطانوی وزیر اعظم کو مجبور کر دیا کہ وہ ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو پارلیمنٹ میں اعلان کریں کہ برطانیہ' ہندوستان سے جون ۱۹۴۸ء تک نکل جائے گا۔۔۔۔۔ اس اعلان کے ساتھ ہی لارڈ ویول کو سبکدوش کر دیا گیا اور آخری وائسرائے کے طور پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان میں آئے۔ جنگ عظیم کے دوران برما کے محاذ پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور جواہر لال نہرو میں دوستی کا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ لیڈی ماؤنٹ بیٹن (ایڈوینا) اور جواہر لال نہرو کے قلبی رشتے کو نہرو کے پرائیوٹ سیکرٹری ایم۔ او متھائی نے بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی۔(۲۵) اسی طرح جواہر لال نہرو کی صاحبزادی محترمہ اندرا گاندھی اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ذاتی عملے کے ایک اہم رکن کے مابین قربت کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ بہر طور لارڈ ماؤنٹ بیٹن

برصغیر کے مسلمانوں کے لئے اس عظیم تاریخی ڈرامے کے آخری منظر میں ایسے ولین بن کر آئے کہ لارڈ کلائیو کی یاد تازہ ہو گئی ـــــــ

کانگریس اور وائسرائے میں یہ سمجھوتہ ہوا (سردار ولبھ بھائی پٹیل کے بیانات وی پی مینن کی دونوں کتابیں' گاندھی کے سیکرٹری پیارے لال کی ڈائری تو اس سلسلے میں محض چند شواہد ہیں) کہ مسلم لیگ کی جھولی میں کٹا پھٹا پاکستان بھی اتنی عجلت میں ڈال دیا جائے کہ وہ اسے سنبھال ہی نہ سکے۔ بہر طور ۳ جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کے منصوبے کا اعلان کیا گیا' جس میں بنگال اور پنجاب کی اسمبلیوں کے مسلم اکثریتی علاقوں کے نمائندوں اور ہندو اکثریتی علاقوں کے نمائندوں کے الگ الگ اجلاس ہونے قرار پائے (تاکہ دونوں صوبوں کی تقسیم کو قانونی جواز فراہم کیا جائے) سندھ اسمبلی کے نمائندوں سے بھی تقسیم ہند کے بارے میں رائے لینے کا فیصلہ کیا گیا' البتہ سرحد اور ضلع سلہٹ میں استصواب رائے کا فیصلہ کیا گیا' کیونکہ سرحد میں کانگریسی حکومت تھی اور اسمبلی میں بھی کانگریسی ارکان کی اکثریت تھی ـــــــ بلوچستان میں رائے شماری کے طریق کار کی توضیح کا کام وائسرائے پر چھوڑ دیا گیا۔ اس منصوبے میں باؤنڈری کمیشن برائے بنگال اور پنجاب کی تشکیل کی گنجائش بھی رکھی گئی۔ اسی روز آل انڈیا ریڈیو سے قائداعظم' جواہر لال نہرو' سردار بلدیو سنگھ اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے خطاب کیا اور اسی دن پریس کانفرنس میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے آزادی ہند کے لئے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کی تاریخ مقرر کرنے کا اعلان کیا (۲۶) (جاپان نے اتحادی افواج کے سامنے ۱۵ اگست ۱۹۴۵ء کو ہتھیار ڈالے تھے۔ غالباً آزادی کی تاریخ اسی مناسبت سے رکھی گئی تھی) پنجاب اور بنگال کے ارکان اسمبلی نے مذکورہ منصوبے کے مطابق تقسیم کے حق میں فیصلہ دیا' سندھ اسمبلی نے بھی پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ کیا' بلوچستان میں شاہی جرگے نے یہی فیصلہ کیا' صوبہ سرحد میں ۶ جولائی سے ۱۶ جولائی ۱۹۴۷ تک استصواب رائے کرایا گیا ـــــــ ۵۷۳۰۰۰ ووٹروں میں سے ۲۹۳۰۰۰ نے رائے دی' جن میں ۲۸۹۰۰۰ رائے دہندگان نے پاکستان کے حق میں رائے دی۔ (۲۷) اور یوں قائداعظم کی بے مثل قیادت اور برصغیر کے مسلمانوں کی رائے سے بالآخر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان دنیا کے نقشے پر نمودار ہوا۔

ز) ریڈ کلف ایوارڈ

۳ جون ۱۹۴۷ء کی سکیم کے پیراگراف نو(۹) کے مطابق مسلم اکثریت کے دو صوبوں' بنگال اور پنجاب کو تقسیم کیا جانا تھا۔ قائداعظم کی خواہش تھی کہ یہ کام اقوام متحدہ کے سپرد کیا جائے مگر جواہرلال نہرو نے اس پر اعتراض کیا کہ اس طرح غیر معمولی اور غیر ضروری تاخیر ہو گی۔(۲۸) پھر قائداعظم نے تجویز پیش کی کہ یہ فریضہ پریوی کونسل کے تین ججوں کے سپرد کیا جائے' تو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے یہ عذر پیش کیا کہ پریوی کونسل کے جج صاحبان معمّر ہیں اور وہ ہندوستان کی گرمی برداشت نہیں کر سکیں گے۔(۲۹) چنانچہ انگلستان کے ایک بیرسٹر سر سیرل ریڈ کلف کی سربراہی میں پنجاب باؤنڈری کمیشن اور بنگال باؤنڈری کمیشن مقرر کیا گیا۔ پنجاب کے لئے کمیشن کے حسب ذیل ارکان تھے۔ مسٹر جسٹس دین محمد' مسٹر جسٹس محمد منیر' مسٹر جسٹس مہرچند مہاجن اور مسٹر جسٹس تیج سنگھ جبکہ بنگال کے لئے کمیشن مسٹر جسٹس ابو صالح محمد اکرم' مسٹر جسٹس ایس اے رحمان' مسٹر جسٹس بیجن کمار مکرجی اور مسٹر جسٹس سی سی بسواس پر مشتمل تھا۔(۳۰)۔۔۔۔۔۔ مسلم لیگ کی طرف سے مسلمانوں کے نقطہ نظر کی وکالت سر ظفراللہ خان نے کی جبکہ ہندوؤں اور سکھوں کا موقف ایم سی سیتل واڈ نے پیش کیا۔ بخشی ٹیک چند اور سردار ہرنام سنگھ ان کے معاون وکلاء تھے۔(۳۱) ۸ جولائی ۱۹۴۷ء کو سر ریڈ کلف دہلی پہنچے۔ ابتدائی ملاقاتوں اور کلکتہ کے اجلاسوں کے بعد کمیشن کے ارکان لاہور پہنچے' جہاں ۲۱ جولائی سے ۳۱ جولائی تک مسلسل اجلاس منعقد ہوتے رہے' سوائے ۲۷ جولائی کے کہ وہ اتوار کا دن تھا۔۔۔۔۔۔۔ جبکہ اس سے پہلے ۱۶ جولائی سے ۲۴ جولائی تک کمیشن کے اجلاس کلکتہ میں ہوئے' (البتہ اتوار ۲۰ جولائی کو تعطیل تھی) ریڈ کلف نے کسی اجلاس میں شرکت نہ کی' البتہ ہر اجلاس کی روداد انہیں دہلی بھجوائی جاتی رہی۔(۳۲) کمیشن سے کہا گیا تھا کہ وہ مذکورہ بالا دونوں صوبوں کے ملحقہ مسلم اکثریتی علاقے کو غیر مسلم اکثریتی علاقے سے الگ کردے' تاہم اس سلسلے میں اسے اختیار دیا گیا تھا کہ وہ "دیگر عوامل" کو بھی پیش نظر رکھے۔ مگر وقت نے ثابت کیا کہ دیگر عوامل سے مراد طبعی عوامل نہ تھے بلکہ سیاسی عوامل بشمول لارڈ ماؤنٹ بیٹن تھے۔۔۔۔۔۔۔ اس کمیشن سے کہا گیا تھا کہ وہ حد بندی کا کام ۱۴ اگست سے پہلے مکمل کرلے' چنانچہ ریڈ کلف نے ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کو ایوارڈ لارڈ ماؤنٹ

بیٹن کے حوالے کر دیا، مگر بعض وجوہ کی بناء پر اس کا اعلان ۱۷ اگست ۱۹۴۷ء کو کیا گیا۔۔۔۔۔۔ اور جب یہ اعلان منظر عام پر آیا تو وہ ہولناک سازش بے نقاب ہوئی، جو لارڈ ماؤنٹ بیٹن، سردار پٹیل، پنڈت جواہر لال نہرو، وی پی مینن اور سکھوں کے اشتراک سے تیار ہوئی تھی۔۔۔۔۔

سر ظفر اللہ اپنی کتاب "تحدیث نعمت" میں لکھتے ہیں: "جس دن بحث ختم ہوئی، اس سہ پہر کو مسٹر موتی لعل سیتل واڈ (ہندوؤں اور سکھوں کے وکیل) شیخ عبدالحق صاحب ایڈووکیٹ کے یہاں چائے پر مدعو تھے۔ چائے پر انہوں نے شیخ صاحب سے فرمایا، اگر حد بندی کا فیصلہ بحث میں پیش کردہ دلائل کی بناء پر ہوا، تو تم لوگ بازی لے جاؤ گے۔" (۳۳) اور ایوارڈ نے ثابت کیا کہ یہ "اگر" انگریزی محاورے کے مطابق "ایک بہت بڑا اگر" تھا۔۔۔۔۔ سکھوں کے لئے نرم گوشہ رکھنے والے، برطانیہ کے اعلیٰ سرکاری افسر پینڈرل مون نے اپنی کتاب (Divide and Quit) میں دہلی میں وائسرائے کی انتظامیہ کے اہم رکن اور سردار پٹیل کے کارندے وی پی مینن سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے، جنہوں نے پینڈرل مون سے پوچھا "کیا حد بندی میں کچھ گڑ بڑ (Juggling) کر کے پنجاب کے فسادات کو کم کیا جا سکتا ہے۔" (۳۴)

جی الانا نے اپنی مرتبہ کتاب (Pakistan Movement : Historic Documents) میں پنجاب میں سی آئی ڈی کے سربراہ مسٹر جینکنز کا ایک مکتوب شامل کیا ہے، جو ۸ جولائی ۱۹۴۷ء کو لکھا گیا تھا اور جس میں کہا گیا تھا "یہ ممکن ہے کہ باؤنڈری کمیشن مسلمانوں کو اس سے بھی زیادہ غیر مطمئن کرے، جتنے وہ اب ہیں۔ (۳۵)

ریڈ کلف ایوارڈ میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ایماء پر جو غیر منصفانہ تبدیلیاں کی گئیں، ان کی دستاویزی شہادتیں موجود ہیں، جن میں گورنر جنرل کے پرائیوٹ سیکرٹری مسٹر ایبل (Mr. Abell) کا ایک خط بھی شامل ہے۔۔۔۔۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ انتظامی وجوہ کی بنا پر گورنر پنجاب سر ایون جینکنز کو ایوارڈ کے اعلان سے چند روز پہلے گورنر جنرل کے سیکرٹری کی طرف سے ٹیلی فون پر اور پھر ایک خط کے ذریعے حد بندی کے اہم نکات سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔ یہ خط بعد میں پنجاب کے گورنر سر فرانس موڈی کے

ہاتھ لگا اور یوں یہ منظر عام پر آیا' اس میں فیروز پور اور زیرہ کی تحصیلیں پاکستانی پنجاب میں ظاہر کی گئی تھیں' جو بعد میں ہندوستان کے حوالے کر دی گئیں۔۔۔۔۔ ایلن کیمبل جانسن نے اپنی کتاب (Mission with Mountbatten) میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی صفائی پیش کرنے کے باوجود اس خط کے وجود سے انکار نہیں کیا۔(۳۶) پنجاب باؤنڈری کمیشن کے ایک رکن جسٹس محمد منیر نے اپنی کتاب (From Jinnah to Zia) میں دیگر شہادتوں کے علاوہ ایک ہندوستانی اخبار میں مطبوعہ سروپ سنگھ چیف انجینئر محکمہ آبپاشی پنجاب کے ایک اعتراف کا ذکر کیا ہے کہ جونہی ۸ اگست ۱۹۴۷ء کو انہیں پتہ چلا کہ ضلع فیروز پور کی تین تحصیلیں اور ہیڈ ورکس پاکستان کے حوالے کیا جا رہا ہے تو انہوں نے فوراً ایک خاص قاصد ریاست بیکانیر کے چیف انجینئر کنور سنگھ کے پاس بھیجا' جنہوں نے ریاست کے مہاراجہ گنگا سنگھ کو مطلع کیا' اور انہوں نے فوراً اپنا خاص ایلچی لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے پاس بھیجا۔ شروع میں تو لارڈ ماؤنٹ بیٹن متامل ہوئے مگر جب انہیں کہا گیا کہ پھر ریاست بیکانیر پاکستان سے الحاق کر لے گی تو وہ رضامند ہو گئے اور ایوارڈ میں مناسب ترمیم کر دی گئی۔(۳۷) مذکورہ کتاب میں انہوں نے یہ حقیقت بھی بیان کی ہے کہ جب انہوں نے فیروز پور کی تین تحصیلوں (فیروز پور' زیرہ' فاضلکا) اور فیروز پور ہیڈ ورکس کی پاکستان میں شمولیت کے بارے میں دلائل دینے شروع کئے تو سر ریڈ کلف نے فوراً انہیں ٹوک دیا کہ اس سلسلے میں دلائل کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ علاقے پاکستان کو ملیں گے۔(۳۸) مگر ایوارڈ میں یہ علاقے ہندوستان کو دے دئے گئے۔۔۔۔۔

اس امر میں تو کوئی شک نہیں کیا جا سکتا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس ایوارڈ کو ہر ممکن طریقے سے پاکستان کو کمزور بنانے کے لئے استعمال کیا۔ چودھری محمد علی نے اپنی کتاب "ظہور پاکستان" میں دہلی میں ماؤنٹ بیٹن کے چیف آف سٹاف لارڈ سے ۹ اگست ۱۹۴۷ء کو اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے' جن کے کمرے میں آویزاں پنجاب کے نقشے پر پنسل سے ایک لکیر کھنچی ہوئی تھی' یہ خط اس سرحد کے عین مطابق تھا' جس کی اطلاع قائداعظم کو دی گئی تھی اور جس کے بارے میں چودھری محمد علی' لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے شکوہ کرنے آئے تھے۔ جب چودھری صاحب نے نقشے پر کھینچی گئی لکیر کی جانب لارڈ اسمے

کی توجہ مبذول کرائی تو ان کا رنگ زرد پڑ گیا اور بڑی گھبراہٹ سے انہوں نے کہا : ''اس نقشے کو کون چھیڑتا رہا ہے؟'' تاہم اس نقشے میں بھی فیروز پور کی مسلم اکثریت کی تحصیلیں پاکستان کی جانب ظاہر کی گئی تھیں۔ (۳۹) پنجاب باؤنڈری کمیشن کے دوسرے مسلمان رکن جسٹس دین محمد نے بھی ایوارڈ کے پس پردہ کارفرما سازش کو بے نقاب کیا ہے۔ انہوں نے ہیلی کاپٹر کے پائلٹ کے پاس پنجاب کا ایسا نقشہ دیکھا' جو بعد میں سرحد کی لکیر بنا۔ یہ پائلٹ سر ریڈ کلف کی ہدایت پر انہیں پنجاب کے بعض علاقے دکھانا چاہتا تھا۔(۴۰)

(Freedom at Midnight) کے مصنفین نے کمال سادگی سے لکھا ہے : ''ریڈ کلف نے اپنے نشتر کے ذریعے بلا ارادہ اور بے توجہی سے (گورداسپور ہندوستان کو دے کر) کشمیر کے بارے میں ہندوستان کے لئے امید پیدا کر دی۔'' (۴۱) ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق ضلع گورداسپور کی آبادی ۱۱'۵۳'۵۱۱ افراد پر مشتمل تھی' جن میں سے مسلمان ۵'۸۹'۹۲۳ تھے جبکہ ہندوؤں اور سکھوں کی آبادی علی الترتیب ۴'۴۴'۹۳۵ اور ۲'۲۱'۲۵۱ تھی۔ گویا ضلع میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۵۱ء۱۴ فیصد' ہندوؤں کا ۲۹ء۶۸ فیصد اور سکھوں کا تناسب آبادی ۱۹ء۱۸ فیصد تھا۔(۴۲) اس ضلع کو ہندوستان میں کیوں شامل کیا گیا؟ اس کا جواب تقسیم ہند کے ایک اہم کردار وی پی مینن نے یہ دیا ہے کہ : ''اس طرح ریاست (کشمیر) کا سڑک کے راستے ہندوستان سے رابطہ قائم ہو گیا۔(۴۳) اگر ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے سرکاری اعداد و شمار کو پیش نظر رکھا جائے' تو پاکستان کو پنجاب میں ضلع گورداسپور کے علاوہ تحصیل ہوشیارپور' تحصیل دسوہہ' تحصیل نکودر' تحصیل جالندھر' تحصیل فیروزپور' تحصیل زیرہ' ضلع لاہور میں سے قصور کا کچھ حصہ اور ضلع لدھیانہ میں سے اس مسلم اکثریتی علاقے سے جو ستلج کے دونوں طرف تھا' محروم رکھا گیا۔۔۔۔۔ اسی طرح ماؤنٹ بیٹن نے ۴ جون ۱۹۴۷ء کو پریس کانفرنس میں جو یہ کہا تھا ''محض ۰۰۸ فیصد کی بنیاد پر باؤنڈری کمیشن پورے ضلع (گورداسپور) کو مسلم اکثریتی علاقے میں شامل نہیں کرے گا۔(۴۴)

یہی نہیں بنگال کی سرحدوں کے تعین میں بھی مسلمانوں کو ہی نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی۔ ایم اے ایچ اصفہانی نے اپنی کتاب ''قائداعظم میری نظر میں'' جسٹس

ایس اے رحمان کے حوالے سے لکھا ہے کہ سلہٹ کے بعض علاقوں اور کچھار سے مکمل طور پر محروم کر دیا گیا۔(۴۵) مگر سب سے بڑی سازش کلکتہ سے متعلق ہوئی۔ اگر "دیگر عوامل" کے الفاظ کی روح کو مد نظر رکھا جاتا تو مسلم بنگال کو اس بندرگاہ اور صنعتی شہر کی اشد ضرورت تھی' دوسرے اس شہر میں مسلمانوں کی آبادی بھی نظرانداز کئے جانے کے قابل نہیں تھی' مگر اس ایوارڈ سے بھی پہلے غیر قانونی طور پر یہ طے کیا گیا کہ کلکتہ ہندوستان کے حصے میں جائے گا ـــــ لارڈ اسمے نے اپنے (Memoirs) میں تسلیم کیا ہے کہ تقسیم ملک کی جس تجویز کی منظوری برطانوی وزارت سے حاصل کی گئی تھی' اس کے مطابق کلکتہ کو ہندوستان میں شامل رکھا گیا تھا' یہ بات مسلم لیگ سے مخفی رکھی گئی اور ظاہر یہ کیا گیا کہ کلکتہ کے متعلق فیصلہ باؤنڈری کمیشن کرے گا۔(۴۶) مدراس کے روزنامہ ہندو کی ۱۶ جولائی ۱۹۵۰ء کی اشاعت میں سردار ولبھ بھائی پٹیل کا ایک بیان شائع ہوا' جو انہوں نے ایک روز پہلے کلکتہ میں دیا تھا' جس میں انہوں نے انکشاف کیا کہ "ہم نے یہ شرط لگائی تھی کہ صرف اسی صورت میں ہم تقسیم پر رضامند ہوں گے کہ ہمیں کلکتہ سے محروم نہیں کیا جائے گا۔"(۴۷)

The Last Years of British India کے مصنف Michael Edwardes نے بجا طور پر لکھا ہے ـــــ "ریڈ کلف نے وہی کچھ کیا' جو اسے بتایا گیا اور اسی کے مطابق اس نے نقشے پر لکیر کھینچی۔(۴۸) مگر قائداعظم کی اصول پسندی اور وسیع القلبی دیکھئے کہ انہوں نے ریڈ کلف ایوارڈ کے اعلان کے بعد فرمایا "یہ ایوارڈ غیر منصفانہ' ناقابل فہم اور نامعقول ہے۔ مگر چاہے یہ غلط' غیر منصفانہ اور نامعقول سہی اور قانونی کی بجائے سیاسی ایوارڈ سہی' مگر ہم نے اسے تسلیم کرنے کی حامی بھری تھی' سو اسے تسلیم کرنا چاہئے۔"(۴۹)

ج) ہندو، مسلم اور سکھ مسلم فسادات

گزشتہ صفحات میں ہندوستان کی اقوام کے اختلاط اور امتیاز کا ذکر ہو چکا ہے۔ یہی امتیاز بعض اوقات (عبادات' تہوار' معاشی مفادات) تناؤ اور کشیدگی پیدا کر دیتا تھا' اس لئے بیسویں صدی کے فسادات کو محض انگریزوں کی حکمت عملی کا نتیجہ قرار نہیں دیا

جا سکتا۔۔۔۔ کیونکہ ۱۸۰۵ء میں بنارس کے ہندو مسلم فسادات سے انیسویں صدی کا آغاز ہوا تھا۔(۵۰)

جوں جوں تحریکِ آزادی پروان چڑھتی گئی' ہندوؤں اور مسلمانوں کے تضادات سامنے آتے گئے' سکھوں اور مسلمانوں کا رشتہ زیادہ ناخوشگوار تھا' حالانکہ سکھوں کے عقائد ہندوؤں کے مقابلے پر مسلمانوں کے زیادہ قریب ہیں' مگر پنجاب میں سکھوں نے اپنے دور اقتدار میں جو ہولناک مظالم ڈھائے اور پھر سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کے ہزاروں رفقاء نے سکھوں کے خلاف جو اعلان جہاد کیا' وہ ہندوستانی تاریخ کا ان مٹ باب ہے۔۔۔۔۔ بیسویں صدی میں پہلا بڑا ہندو مسلم فساد ملتان میں ہوا جو ۱۹۲۲ء میں محرم کے موقع پر ہوا۔(۵۱) اور پھر فسادات کی اس لہر نے دہلی' الہ آباد' لکھنؤ' ناگ پور' جبل پور' گلبرگ' شاہ جہاں پور اور کوہاٹ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔۔۔ اس کے بعد کانگریسی وزارتوں کے دورِ اقتدار (۱۹۳۷۔۱۹۳۹) میں وقتاً فوقتاً یہ فسادات ہوتے رہے۔ یہ فسادات زیادہ تر گئوکشی اور مساجد کی بے حرمتی کے سلسلے میں ہوئے۔۔۔۔ پنجاب میں بھی مسجد شہید گنج کا واقعہ پیش آیا۔۔۔۔ سکھر اور بنوں میں بھی انہی ایام میں فسادات ہوئے مگر ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۷ء تک برصغیر میں جو ہولناک فسادات ہوئے وہ تاریخ انسانیت کا ایک شرمناک باب ہیں۔۔۔۔۔ لوٹ مار' آتش زنی' عصمت دری' قتل و غارت' جبری تبدیلی مذہب' اغوا دنیا کے کسی مذہب میں روا نہیں۔ جس پیمانے پر نفرت کی یہ آگ بھڑکی اسے نہ محض مسلم لیگ کے یوم راست اقدام کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی برطانوی حکمت عملی کا شعبدہ۔۔۔۔۔ ان کی تہہ میں ہندوستانی اقوام کا وہ باہمی عناد بول رہا تھا' جو صدیوں سے سینوں میں پل رہا تھا' یا پھر غلامی کی زنجیریں کٹنے کی وحشیانہ مسرت! یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک سو سالہ برطانوی قانون اور انتظام کے تعطل کے وقفے نے روحانیت کی سرزمین میں بسنے والوں کو جنگلی بنا دیا۔۔۔۔۔ ویسے تو یہ فسادات پورے برصغیر کے منظر پر چھا گئے' مگر ان کا زیادہ زور پہلے بنگال اور پنجاب میں رہا۔۔۔۔۔ ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو کلکتہ میں جو خون کی ہولی کھیلی گئی اور نقصان بھی زیادہ تر مسلمانوں کا ہوا (لارڈ ویول نے اپنے روزنامچے میں ۱۸ اگست ۱۹۴۶ء کے دن لکھا : "(بنگال کے) گورنر نے مجھے بتایا ہے کہ مسلمان ہلاک شدگان کی تعداد زیادہ

ہے۔(۵۲) اس کے فوراً بعد بمبئی' نواکھالی' گڈھ مکیشر اور بہار میں ہولناک فسادات شروع ہوئے۔۔۔۔۔ نواکھالی اور پیٹرہ کے ضلعوں میں ہندوؤں کا جانی نقصان زیادہ ہوا مگر اس کو ہندو پریس نے اس طرح اچھالا کہ بہار کے مسلمانوں پر آسمان ٹوٹ پڑا۔۔۔۔۔ "یہاں مسلمانوں کا جانی نقصان ۳۰ ہزار بتایا جاتا ہے اور تقریباً ڈیڑھ لاکھ مسلمان بے گھر ہوئے۔"(۵۳) آئن سیفنز نے اپنی کتاب (Horned Moon) اور لیفٹیننٹ جنرل ٹکر نے اپنی کتاب (While Memory Serves) میں غیر مسلموں کی منصوبہ بندی اور اور شقاوت قلبی کا تفصیل سے ذکر کیا ہے' تاہم برصغیر کے عوام تعصب کے باوجود اس امر کو نہیں بھلا سکتے کہ مہاتما گاندھی نے بنگال کی آگ کو حسین شہید سہروردی کے ساتھ مل کر ٹھنڈا کرنے میں بہت کردار ادا کیا۔۔۔۔۔

پنجاب میں سکھ ایک عرصے سے ان فسادات کی تیاری کر رہے تھے' اور انہوں نے ان ارادوں سے حکومت کو بھی مطلع کر دیا تھا' مگر پنجاب کے گورنر اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن بروقت کوئی امتناعی قدم نہ اٹھا سکے' چنانچہ برصغیر کے فسادات کا ہولناک ایکٹ پنجاب میں پیش کیا گیا۔۔۔۔۔ ۲۰ مارچ ۱۹۴۷ء کو پنجاب کی حکومت نے سرکاری طور پر تسلیم کیا کہ حالیہ فسادات میں ۲۰۴۹ افراد ہلاک' ۱۱۰۳ زخمی ہوئے جن میں ۱۰۳۸ دیہی علاقوں میں ہلاک ہوئے' مگر یہ تخمینہ بہت کم تھا۔ بعد کے جائزے سے پتہ چلا کہ مارچ سے اگست کے اوائل تک پانچ ہزار افراد ہلاک اور تین ہزار شدید زخمی ہوئے۔(۵۴) پنجاب کے تقریباً ہر شہر اور دیہات میں نفرت کی آگ کچھ اس طرح پھیلی کہ سچ مچ پنجاب کے دریاؤں میں آگ لگ گئی۔۔۔۔ ادھر انگریزوں اور کانگریس کی سازش نے ریڈ کلف ایوارڈ کی صورت میں رہی سہی کسر پوری کر دی' اور یوں مسلمان مہاجرین کی پر صعوبت راہ اور کٹھن (اور بعض علاقوں میں غیر متوقع) کر دی'۔۔۔۔ اس موقع پر مہاراجہ پٹیالہ نے پورے سکھ ہونے کا ثبوت دیا اور اپنی ریاست اور اس سے ملحقہ علاقوں میں مسلمانوں کے خون سے جی بھر کے ہولی کھیلی۔

مہاجرین اور شرنارتھیوں کے قافلے بھی نفرت کی اس آگ میں جھلس گئے' بوڑھوں' بچوں اور عورتوں پر بھی رحم نہ کھایا گیا' ریل کی پٹڑیاں اکھاڑ کر' سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کر کے ان قافلوں اور ٹرینوں کو روکا جاتا' اور پھر انہیں خون سے غسل دیا

جاتا' اکثر اوقات گاڑیاں اس طرح بھی اپنی منزل پر پہنچیں کہ سٹیشن پر اترنے کے لئے کوئی مسافر نہ تھا'------- اس سلسلے میں فرق البتہ یہ تھا کہ "مسلم مہاجرین کی ریلوں پر ۶ اگست سے ۵ اکتوبر تک ۵۴ حملے کئے گئے' جن میں ۲۰ ہزار سے زیادہ لوگ مارے گئے' جبکہ غیر مسلم شرنار تھیوں کی ٹرینوں پر ۱۱ اگست سے ۲۵ ستمبر کے دوران ۲۵ حملے ہوئے' جن میں ایک ہزار سے کم افراد ہلاک ہوئے۔ (۵۵)------- جوش انتقام نے انسانوں کی آنکھوں سے بینائی چھین لی تھی' چنانچہ ہسپتالوں پر بھی حملے کئے گئے' جس کی نمایاں مثال ولنگڈن ہسپتال دہلی پر حملہ ہے ------- اس کے علاوہ سید حسن ریاض نے لکھا ہے کہ غیر مسلموں کی جانب سے سیالکوٹ اور جموں کی سرحدوں پر ۶۳ حملے اور واہگہ اور قصور کی سرحدوں پر ۲۸ چھاپے مارے گئے۔ (۵۶)------- "Freedom at Midnight" کے مصنفین نے ایک ہندوستانی جج جی' ڈی گھوسلہ کے حوالے سے ان فسادات کے ہلاک شدگان کا تخمینہ پانچ لاکھ پیش کیا ہے۔(۵۷)------- جبکہ بھارتی پنجاب کے پہلے گورنر سرچندولال ترویدی نے پنجاب ہلاک شدگان کا اندازہ سوا دو لاکھ لگایا۔(۵۸)------- The Great Divide کے مصنف H.V.Hodson کا خیال ہے کہ فسادات کی لپیٹ میں آکر ہلاک ہونے والوں کی تعداد دو اور ڈھائی لاکھ کے درمیان ہے'------- پینڈرل مون نے پاکستانی پنجاب کے گورنر سر فرانسس موڈی' بہاولپور ریاست میں اپنے تجربات اور ہندوستان میں موجود اپنے دوستوں سے تبادلہ خیال کے بعد یہ اندازہ پیش کیا ہے "مغربی پاکستان اور بہاولپور میں ۶۰۰۰۰ کے قریب غیر مسلم مارے گئے' جبکہ مشرقی پنجاب اور پنجاب کی ریاستوں میں ۱۲۰۰۰۰ کے لگ بھگ مسلمان' اگر کچھ اور مقتولین کو بھی شامل کرلیا جائے' تو کل تعداد دو لاکھ ہو جاتی ہے۔(۵۹)

فسادات کی خونی بارش کے دوران میں لاکھوں انسان گھربار' عزیز رشتہ دار' اور مٹی کی خوشبو کو چھوڑ کر اپنے اپنے خواب کی تعبیر آنکھوں میں بسا کر اور ساتھ ہی ساتھ حفظ جان کے فطری جذبے سے مجبور ہو کر لاکھوں کی تعداد میں سرحدوں کے دونوں طرف نقل مکانی کا دکھ سہتے رہے'------- پینڈرل مون نے لکھا ہے "اگست ۱۹۴۷ء اور مارچ ۱۹۴۸ء کے درمیان ۴۵ لاکھ ہندو اور سکھ مغربی پاکستان سے سرحد پار گئے جبکہ

۶۰ لاکھ مسلمانوں نے سرحد پار کر کے ادھر کا رخ کیا۔ (۶۰)" انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندوؤں اور سکھوں نے ۶۷ لاکھ ایکڑ زمین اور پانچ ارب روپے کی جائیداد چھوڑی، جبکہ مسلمانوں نے ۴۷ لاکھ ایکڑ زمین اور ایک ارب روپے کی جائیداد اپنے پیچھے چھوڑی۔ (۶۱) ترک وطن نے مہاجرین کو جن معاشی، ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں سے دوچار کیا، اس کا جائزہ لینا اس کتاب کے موضوع سے مناسبت نہیں رکھتا، البتہ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہوگا کہ بوجوہ پاکستان میں مہاجرین کی صحیح تعداد کبھی متعین نہ ہو سکی، ------ پینڈرل مون نے یہ تعداد ۶۰ لاکھ بیان کی ہے تو ڈاکٹر صفدر محمود نے اس سے دوگنی یعنی ایک کروڑ بیس لاکھ (۶۲) ------ تاریخ، فسادات کے حقیقی اسباب اور نتائج کو چھپا نہیں سکی اور اب شواہد سے یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ اس میں مسلمانوں کا نقصان ہر اعتبار سے زیادہ ہوا، حتیٰ کہ جب مغویہ عورتوں اور بازیابی کی مہم شروع ہوئی تو اکتوبر ۱۹۵۲ء تک پاکستان میں برآمد ہونے والی غیر مسلم عورتوں اور بچوں کی تعداد ۸۳۳۶ تھی، جبکہ ہندوستان سے ۱۶۹۱۹ مسلمان عورتوں اور بچوں کو برآمد کیا گیا۔ (۶۳)

تحریک پاکستان۔ چند سوالات، چند حقائق

قیام پاکستان کے اتنے برس بعد بھی بعض غیر ملکی اور بھارتی مورخ ابھی تک ان سوالات کے متعصبانہ جوابات دینے میں مصروف ہیں کہ کیا تقسیم ہند برطانوی سامراج کی سازش تھی؟ کیا مسلم لیگ برطانیہ کے کاسہ لیس جاگیرداروں اور نوابوں پر مشتمل ایک تنگ نظر اور فرقہ پرست تنظیم تھی؟ خود پاکستان میں ابھی تک کئی دلچسپ اور کئی تکلیف دہ سوالات گردش میں ہیں، کیا پنجاب کی تقسیم ناگزیر تھی؟ قرارداد پاکستان (۱۹۴۰ء) کا حقیقی مفہوم کیا تھا؟ اگر مقصود آزاد اور خود مختار پاکستان کا قیام تھا، تو کیبنٹ مشن کے منصوبے کو مسلم لیگ نے کیوں تسلیم کیا؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کیا پاکستان کے قیام کا بنیادی مقصد دینی ریاست تشکیل دینا تھا؟ ------ جہاں تک پہلی نوعیت کے الزامات کا تعلق ہے، میرے خیال میں غیر ملکی مورخین نے بھی زیادہ تر قوم پرست مسلمانوں کے بیانات، کتب اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کی کتاب India Divided پر انحصار کیا ہے، قوم پرست مسلمان، اپنی قسمت کانگریس سے وابستہ کرنے کے بعد جس طرح کی ذہنی کیفیت

سے دو چار تھے' اس کے پیش نظر ان کے بیانات کو غیر متعصبانہ اور غیر جذباتی قرار نہیں دیا جاسکتا' ------- اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کی مسلم دشمنی کا اندازہ اسی ایک امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب وہ بھارت کے صدر بنے' تو انہوں نے راشٹرپتی بھون کے مسلمان عملے کو ملازمت سے جواب دے دیا۔ (۶۴) -------- پھر وہ سومنات تشریف لے گئے اور عین اس جگہ شولنگ کا بت نصب کیا' جہاں محمود غزنوی نے گرز مار کر بت شکن کی شہرت پائی تھی۔ (۶۵) -------- اس کے علاوہ جہاں تک مسلم لیگ کے قیام یا شملہ وفد کی تشکیل میں انگریزوں کی اعانت کا معاملہ ہے' تو خود کانگریس کی تشکیل بھی انہی مہربان' ہاتھوں کا کرشمہ تھی' جن تاریخی حالات میں شملہ وفد یا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا' در مودر پی سنگھل نے بجا طور پر لکھا ہے "ہندوستانی سیاست ایک ایسے مرحلے پر پہنچ چکی تھی کہ مسلمانوں کی ایک فرقہ وارانہ' تنظیم کا قیام ناگزیر تھا' چاہے یہ وفاداروں پر مشتمل ہوتی' چاہے تشدد اختیار کرنے والوں پر (۶۶)" اسی طرح انگلستان کے وزرائے اعظم اور برطانوی ہند کے تمام وائسرائے وقتاً فوقتاً متحدہ ہندوستان کے حق میں بیان دیتے رہے ہیں' لارڈ ویول نے ۱۹۴۴ء میں کہہ دیا تھا "آپ جغرافیہ کو تبدیل نہیں کرسکتے' ہندوستان ایک قدرتی وحدت ہے۔ (۶۷) وزیر اعظم ایٹلی نے اسی قسم کا موقف ایک ٹیلی ویژن انٹرویو میں پیش کیا' (۶۸) جبکہ کرپس مشن' کیبنٹ مشن کے ارکان اور خود لارڈ ماؤنٹ بیٹن مسلسل کوشش (سازش) کرتے رہے کہ تقسیم عمل میں نہ آئے (اس سلسلے میں فیلڈ مارشل سر آکنلیک کے بیانات بھی اب تاریخ کا حصہ ہیں) خود کانگریس کے ایک نمائندے کرشنا مینن نے وزیر اعظم انگلستان سے ملاقات کر کے کانگریس اور جواہر لال نہرو کا یہ عندیہ ان تک پہنچایا کہ وہ لارڈ ویول کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان میں بطور وائسرائے دیکھنا پسند کریں گے۔ (۶۹) -------- تقسیم ہند کے منصوبے میں کانگریسی ایماء پر ترمیم' ریڈ کلف ایوارڈ میں کی گئی دھاندلی' بھارتی ریاستوں کا الحاق اور جنگ کشمیر ماؤنٹ بیٹن کی بھارت نوازی کی محض چند مثالیں ہیں' -------

یہ درست ہے کہ تحریک آزادی کی خاطر کانگریسی رہنماؤں نے قید و بند کی جو صعوبتیں برداشت کیں' مسلم لیگ کے قائدین کی پوشاک پر ایسے تمغے نہیں ہیں' مہاتما گاندھی نے اپنی زندگی کے ۲۳۳۸ دن جیل میں گزارے' -------- نہرو خاندان کی

صعوبتیں بھی بلاشبہ قابل قدر ہیں' اور دیگر کانگریسی مردوں اور عورتوں کی جدوجہد کی آزادی کی راہ میں قربانیاں بھی یقیناً لائق تحسین ہیں' مگر قائداعظم قانونی مزاج رکھتے تھے اور وہ تحریک پاکستان کو قانونی جنگ بنانا چاہتے تھے' اس لئے وہ ایجی ٹیشن پر مبنی سیاست سے الگ تھلگ رہے' ——— یہ بھی درست ہے کہ مسلم لیگ برطانیہ کو ہندوستان سے نکالنے میں عجلت کا مظاہرہ نہیں کر رہی تھی' مگر اس کا سبب سامراج دوستی نہیں بلکہ انگریزوں کے منظر عام سے ہٹتے ہی بے رحم ہندو اکثریت کی بالادستی کا اندیشہ تھا' ——— اس امر میں بھی شک نہیں کہ مسلم لیگ کی قیادت پر بالائی متوسط طبقے کے متمول افراد' جاگیرداروں' نوابوں اور زمینداروں کا غلبہ تھا' مگر خود کانگریس کے پشت پناہ بھی تو سرمایہ دار تھے جو جاگیرداروں اور نوابوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو "De-class" ہونا دکھانے میں سہولت محسوس کرتے تھے' ——— کانگریس کے پاس سماجی اصلاح کا پروگرام بھی بڑا پرکشش تھا' تعلیم یافتہ افراد میں بھی سادگی' کھدر کا لباس چرخہ کاتنے' ہاتھ سے صفائی کرنے اور تعلیم عام کرنے کے مہاتما گاندھی کے اصول اپنانے کا جذبہ نمو پا رہا تھا' مسلم لیگ نے بہت بعد میں رابطہ عوام مہم کا آغاز کیا' ———

جہاں تک قرارداد پاکستان کی روح کا تعلق ہے' اس کی وحدت سے انکار نہیں کیا جاسکتا' البتہ الفاظ میں حقیقت پسندی کے غلبے نے اب تک تعبیر و تاویل کا دروازہ کھول دیا ہے ——— جہاں تک پنجاب کی تقسیم کا تعلق ہے' وہ سکھوں کی ضد کی وجہ سے ناگزیر ہوئی' پینڈرل مون نے اپنی کتاب Divide and Quit میں جگہ جگہ قائداعظم پر یہ الزام لگایا ہے کہ انہوں نے سکھوں کی دلجوئی کی کوئی کوشش نہیں کی' مگر مہاراجہ پٹیالہ کی یادداشتوں (۱۷) اور دیگر شواہد سے اس امر کا سراغ ملتا ہے کہ قائداعظم نے سکھوں کو پاکستان میں ہر طرح کی مراعات دینے کی پیشکش کی تھی' مگر پنجاب کی مقبول کہاوتوں کی عین مطابق' سکھوں کو سمجھانا بہت مشکل ثابت ہوا' ——— اس تقسیم کی ذمہ داری سے انگریزوں کے حقیقی کاسہ لیس وہ مسلمان زمیندار بری الذمہ نہیں ہوسکتے' جو یونینسٹ پارٹی کے ارکان تھے' اس پارٹی نے ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں شکست کھانے کے باوجود' کانگریس' اکالی دل اور دوسرے غیر مسلم دھڑوں سے مل کر وزارت بنا

لی اور یوں مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان میں پنجاب کی گرمجوش شمولیت کو نقصان پہنچایا' ——— بنگال میں مسلم وزیر اعلیٰ حسین شہید سہروردی نے عین قیام پاکستان کے قریب آزاد بنگال' کی سکیم پیش کی' سندھ میں بھی مسلم لیگی ارکان باہم دست و گریبان رہے' صوبہ سرحد میں تو سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان اور ان کی سرخ پوش جماعت بر سراقتدار رہی' جنہوں نے آخری وقت تک قیام پاکستان کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی' ایسی صورت میں' ایک بپھرے ہوئے متعصب گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن (جو ہندوستان اور پاکستان کے مشترکہ گورنر جنرل بننا چاہتے تھے' مگر قائداعظم نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اس تجویز کو رد کر دیا تھا) اور تلملائی ہوئی کانگریس کی مشترکہ قوت کے مقابل آکر قائداعظم نے جس طرح کا بھی پاکستان حاصل کیا وہ تاریخ عالم کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے' ———

اس سلسلے میں علمائے کرام کی طرف سے پاکستان اور قائداعظم کی جس قدر مخالفت کی گئی' وہ نہایت افسوس ناک حقیقت ہے' ——— سید ہاشمی فرید آبادی نے لکھا ہے "مولوی صاحبان کا ایک کمکی دستہ اس (کانگریس) کے ساتھ آملا تھا' اور مسلم لیگ خصوصا مسٹر جناح کے خلاف لعن طعن کا کیچڑ اچھالتا پھرتا تھا' ان حضرات نے جس قدر زیادہ مبالغے سے کام لیا' اسی قدر ان کے اعتراضات کی وقعت گھٹی اور معترض مولویوں سے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی نفرت بڑھی (۷۲)——— جنہوں نے پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ اسے حالات کی ستم ظریفی کہئے کہ بعد میں ایسی جماعتوں نے نظریہ پاکستان کی تشریح و توضیح کا فریضہ سنبھال لیا' بہر طور مولانا اشرف علی تھانوی' مولانا شبیر احمد عثمانی' مولانا عبدالحامد بدایونی اور پیر صاحب آف مانکی شریف' پاکستان اور قائداعظم کی حمایت کرتے رہے' ——— پاکستان میں قائم ہونے والی حکومتوں نے وقتاً فوقتاً اپنے اپنے مفادات کو پروان چڑھانے کے لئے تحریک پاکستان کو تاریخی تقاضوں سے جدا کر کے اپنی پسند کے مقاصد عطا کرنے کی کوشش کی' ——— یہ تو طے ہے کہ قائداعظم پاکستان میں مُلاؤں کی حکومت نہیں چاہتے تھے' (انہوں نے جوگندر ناتھ منڈل کو پاکستان کا پہلا وزیر قانون بنایا' پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی اور سٹیٹ بینک آف پاکستان کے افتتاح کے موقعے پر ان کے خطبات' غیر ملکی صحافیوں سے ان کے انٹرویو' اس امر کے گواہ ہیں)

——— درحقیقت پاکستان کے قیام کے محرکات ایجابی بھی ہیں اور سلبی بھی، تاریخی مذہبی، تہذیبی اور سیاسی بھی ہیں اور نفسیاتی بھی، ——— اور سب کو پیش نظر نہ بھی رکھا جائے، تو قیام پاکستان کے بعد پاکستانی قوم کے کردار کے بنیادی اوصاف اور خصائص ان محرکات کی نشان دہی کرتے رہے ہیں، ———

حوالہ جات

۱۔۲۔ "پاکستان مومنٹ، ہسٹارک ڈاکومنٹس" ص ۲۲۶۔۲۲۷

۳۔ "دی فال آف برٹش ایمپائر" ص ۲۴۱

۴۔ "ظہور پاکستان" ص ۱۳۵۔۱۳۶

۵۔ ایضاً ص ۶۴

۶۔ "دی وائسرائیز جرنل" ص ۳۷

۷۔ ایضاً ص ۶۱

۸۔ ایضاً ص ۱۹

۹۔ ایضاً ص ۱۳

۱۰۔ "پاکستان" ص ۶۹

۱۱۔ "دی فال آف برٹش ایمپائر" ص ۶۴

۱۲۔ "پاکستان" ص ۶۸

۱۳۔ "پاکستان مومنٹ، ہسٹارک ڈاکومنٹس" ص ۳۹۶

۱۴۔ "دی وائسرائیز جرنل" ص ۳۱۱

۱۵۔ ایضاً ص ۲۶۴

۱۶۔ ایضاً ص ۲۳۶

۱۷۔ "محمد علی جناح" از ہیکٹر بولائتھو (ترجمہ زہیر صدیقی) ص ۲۴۲۔۲۴۳

۱۸۔ "پاکستان ناگزیر تھا" ص ۴۲۲

۱۹۔ "انڈیا ونز فریڈم" ص ۱۵۴

۲۰۔ "قائد اعظم میری نظر میں" ص ۸۷

۲۱۔ ایضاً ص ۷۸-۷۹

۲۲۔ "دی گریٹ ڈیوائیڈ" از ہڈسن ص ۱۶۶

۲۳۔ "انڈیا ونز فریڈم" ص ۱۵۹

۲۴۔ "ظہور پاکستان" ص ۱۴۴

۲۵۔ "نہرو دور کی یادیں" صفحات ۲۵، ۱۹۰، ۲۱۱، ۲۱۴

۲۶۔ "فریڈم ایٹ مڈنائٹ" ص ۱۶۵

۲۷۔ "اے ہسٹری آف پاکستان" ص ۹۵

۲۸۔ "مشن ود ماؤنٹ بیٹن' از ایلن کیمبل جانسن" ص ۱۲۴ و' دی لاسٹ ڈیز آف برٹش راج از لیونارڈ موسلے ص ۱۹۳

۲۹۔ "تحدیث نعمت" ص ۵۰۶

۳۰۔ "پاکستان مووُمنٹ' ہسٹارک ڈاکومنٹس" ص ۵۴۱

۳۱۔ "قائداعظم اور تحریک پاکستان" از ڈاکٹر وحید قریشی لاہور۔ ۸۰، ص ۴۷

۳۲۔ "پاکستان ان چینجنگ ورڈ" (دی پنجاب باؤنڈری کمیشن) از معصومہ حسن، ص ۲۲۔ ۲۳

۳۳۔ "تحدیث نعمت" ص ۵۰۷

۳۴۔ "ڈیوائیڈ اینڈ کوئٹ" ص ۹۶

۳۵۔ "پاکستان مووُمنٹ ہسٹارک ڈاکومنٹس" ص ۵۴۲

۳۶۔ "مشن ود ماؤنٹ بیٹن" (انگریزی) ص ۳۰۹

۳۷۔ "فرام جناح ٹو ضیاء" ص ۱۴-۱۵

۳۸۔ ایضاً ص ۱۳-۱۴

۳۹۔ "ظہور پاکستان" ص ۲۶۷

۴۰۔ "تحدیث نعمت" ص ۵۰۶-۵۰۷

۴۱۔ "فریڈم ایٹ مڈنائٹ"

۴۲۔ "سینس آف انڈیا" (انگریزی) جلد ششم۔ دہلی۔ ۴۱، ص ۵۸-۵۹

۴۳۔ "دی سٹوری آف دی ایگریشن آف انڈین سٹیٹس" (انگریزی) ص ۳۹۵

۴۴۔ "ماؤنٹ بیٹن آف برما' ٹائم اونلی ٹو لک فارورڈ" از نکولس کائے لندن۔ ۴۹، ص ۳۰

۴۵۔ "قائداعظم میری نظر میں" ص ۸۷

۴۶۔ "تحدیث نعمت" ص ۵۱۵

۴۷۔ "ظہور پاکستان" ص ۲۶

۴۸۔ "دی لاسٹ ایرز آف برٹش انڈیا" ص ۲۰۹

۴۹۔ "قائداعظم اور تحریک پاکستان" ص ۷۰

۵۰۔ "ہندوستان پس منظر و پیش منظر" ص ۳۱

۵۱۔ "پاکستان ناگزیر تھا" ص ۱۵۰

۵۲۔ "دی وائسریز جرنل" ص ۳۳۵

۵۳۔ "قائداعظم میری نظر میں" ص

۵۴۔ "ڈیوائیڈ اینڈ کوئٹ" ص ۷۹

۵۵۔ "تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت" (جلد دوم) ص ۲۶۶

۵۶۔ "پاکستان ناگزیر تھا" ص ۵۴۰

۵۷۔۵۸۔ "فریڈم ایٹ مڈنائٹ" ص ۳۴۲

۵۹۔ "ڈیوائیڈ اینڈ کوئٹ" اختتامی صفحہ

۶۰۔۶۱۔ "ڈیوائیڈ اینڈ کوئٹ" ص ۲۶۸

۶۲۔ "پاکستان مسلم لیگ کا دور حکومت" ص ۴۹

۶۳۔ "ظہور پاکستان" ص ۳۲۹

۶۴۔۶۵۔ "نہرو دور کی یادیں" ص ۷۵

۶۶۔ "پاکستان" ص ۴۹

۶۷۔ "قائداعظم۔ ایک قوم کی سرگزشت" ص ۴۲۳

۶۸۔ "قائداعظم میری نظر میں" ص ۸۸

۶۹۔ "فریڈم ایٹ مڈنائٹ" ص ۸

۷۰۔ ایضاً ص ۶۰

۷۱۔ "قائداعظم میری نظر میں" ص ۸۹

۷۲۔ "تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت" (جلد دوم) ص ۵۹۹

ضمیمہ الف

سر محمد اقبال کا خطبہ صدارت
(باجلاس آل انڈیا مسلم لیگ الہ آباد دسمبر ۱۹۳۰ء)

حضرات !

میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے ایک ایسے وقت میں مجھے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کا اعزاز بخشا ہے جب کہ مسلمانان ہندوستان کی سیاسی زندگی نے ایک نہایت ہی نازک صورت اختیار کر لی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس عظیم الشان اجتماع میں ان حضرات کی کمی نہیں جن کا تجربہ مجھ سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور جن کی معاملات فہمی کا میں دل سے قائل ہوں۔ لہٰذا یہ بڑی جسارت ہو گی اگر میں ان مسائل میں جن کے فیصلے کے لئے آج یہ حضرات یہاں جمع ہوئے ہیں ان کی رہنمائی کا دعویٰ کروں۔ میں کسی جماعت کا رہنما نہیں نہ کسی رہنما کا پیرو ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کا زائد حصہ اسلام اور اسلامی فقہ و سیاست' تہذیب و تمدن اور ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس مسلسل اور متواتر تعلق کی بدولت جو مجھے تعلیمات اسلامی کی روح سے جیسا کہ مختلف زبانوں میں اس کا اظہار ہوا ہے رہا ہے میں نے اس امر کے متعلق ایک خاص بصیرت پیدا کر لی ہے کہ ایک عالمگیر حقیقت کے اعتبار سے اسلام کی حیثیت کیا ہے۔ لہٰذا یہ فرض کرتے ہوئے کہ مسلمانان ہندوستان بہرحال اپنی اسلامی روح کو برقرار رکھنے پر مصر ہیں میں کوشش کروں گا کہ آپ کے فیصلوں کی رہنمائی کی بجائے اسی بصیرت کی روشنی میں خواہ اس کی قدر و قیمت کچھ بھی ہو آپ کے دل میں اس بنیادی اصول کا احساس پیدا کر دوں جس پر میری رائے میں ہمارے تمام فیصلوں کا عام انحصار ہونا چاہئے۔

اسلام اور قومیت

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ بحیثیت ایک اخلاقی نصب العین اور نظام سیاست کے (اس آخری لفظ سے میرا مطلب ایک ایسی جماعت ہے جس کا نظم و انضباط کسی نظام قانون کے ماتحت عمل میں آتا ہو لیکن جس کے اندر ایک مخصوص اخلاقی روح

سرگرم کار ہو) اسلام ہی وہ سب سے بڑا جزو ترکیبی تھا جس سے مسلمانان ہند کی تاریخ حیات متاثر ہوئی۔ اسلام ہی کی بدولت مسلمانوں کے سینے ان جذبات و عواطف سے معمور ہوئے جن پر جماعتوں کو زندگی کا دارومدار ہے اور جن سے متفرق و منتشر افراد بتدریج متحد ہو کر ایک متمیز و معین قوم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور ان کے اندر ایک مخصوص اخلاقی شعور پیدا ہو جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ دنیا بھر میں شاید ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں اسلام کی وحدت خیز قوت کا بہترین اظہار ہوا ہے۔ دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی جماعت اسلامی کی ترکیب صرف اسلام ہی کی رہن منت ہے کیونکہ اسلامی تمدن کے اندر ایک مخصوص اخلاقی روح کارفرما ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کا اندرونی اتحاد اور ان کی نمایاں یکسانیت ان قوانین و ادارات کی شرمندہ احسان ہے جو تہذیب اسلامی سے وابستہ ہیں لیکن اس وقت مغرب کے سیاسی افکار نے نہایت تیزی کے ساتھ نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان سے باہر تمام دنیائے اسلام میں ایک انقلاب پیدا کر رکھا ہے۔ نوجوان مسلمانوں کی یہ خواہش ہے کہ وہ ان افکار کو عملاً اپنی زندگی کا جزو بنا لیں۔ انہوں نے اس امر پر مطلق غور نہیں کیا کہ وہ کون سے اسباب تھے جن کے ماتحت ان افکار نے مغرب میں نشو و نما پایا۔ یاد رکھنا چاہئے کہ سرزمین مغرب میں مسیحیت کا وجود محض ایک رہبانی نظام کی حیثیت رکھتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس سے کلیسا کی ایک وسیع حکومت قائم ہوئی۔ لوتھر کا احتجاج دراصل اسی کلیسائی حکومت کے خلاف تھا۔ اس کو کسی دنیوی نظام سیاست سے کوئی بحث نہیں تھی کیونکہ اس قسم کا کوئی نظام سیاست مسیحیت میں موجود نہیں تھا۔ غور سے دیکھا جائے تو لوتھر کی بغاوت ہر طرح سے حق بجانب تھی اگرچہ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ خود لوتھر کو بھی اس امر کا احساس نہ تھا کہ جن مخصوص حالات کے ماتحت اس کی تحریک کا آغاز ہوا ہے اس کا نتیجہ بالآخر یہ ہو گا کہ مسیح علیہ السلام کے عالمگیر نظام اخلاق کی بجائے مغرب میں ہر طرف بے شمار ایسے اخلاقی نظام پیدا ہو جائیں گے جو خاص خاص قوموں سے متعلق ہوں گے اور لہٰذا ان کا حلقہ اثر بالکل محدود رہ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جس ذہنی تحریک کا آغاز لوتھر اور روسو کی ذات سے ہوا اس نے مسیحی دنیا کی وحدت کو توڑ کر اسے ایک ایسی غیر مربوط اور منتشر کثرت میں تقسیم کر دیا جس سے اہل مغرب کی نگاہیں اس عالمگیر

مطمحِ نظر سے ہٹ کر جو تمام نوعِ انسانی سے متعلق تھا اقوام و ملل کی تنگ حدود میں الجھ گئیں۔ اس نئے تخیلِ حیات کے لئے انہیں ایک کہیں زیادہ واقعی اور مرئی اساس مثلاً تصورِ وطنیت کی ضرورت محسوس ہوئی جس کا اظہار بالآخر ان سیاسی نظامات کی شکل میں ہوا جنھوں نے جذبہ قومیت کے ماتحت پرورش پائی۔ یعنی جن کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ سیاسی اتحاد و اتفاق کا وجود عقیدہ وطنیت ہی کے ماتحت ممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مذہب کا تصور یہی ہے کہ اس کا تعلق صرف آخرت سے ہے انسان کی دنیوی زندگی سے اسے کوئی سروکار نہیں تو جو انقلاب مسیحی دنیا میں رونما ہوا ہے وہ ایک طبیعی امر تھا۔ مسیح علیہ السلام کا عالمگیر نظامِ اخلاق نیست و نابود ہو چکا ہے اور اس کی جگہ اخلاقیات و سیاسیات کے قومی نظامات نے لے لی ہے۔ اس سے اہلِ مغرب بجا طور پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مذہب کا معاملہ ہر فرد کی اپنی ذات تک محدود ہے۔ اسے دنیوی زندگی سے کوئی تعلق نہیں، لیکن اسلام کے نزدیک ذاتِ انسانی بجائے خود ایک وحدت ہے۔ وہ مادے اور روح کی کسی ناقابلِ اتحاد ثنویت کا قائل نہیں۔ مذہب اسلام کی رو سے خدا اور کائنات، کلیسا اور ریاست اور روح اور مادہ ایک ہی کل کے مختلف اجزاء ہیں۔ انسان کسی ناپاک دنیا کا باشندہ نہیں جس کو اسے ایک روحانی دنیا کی خاطر جو کسی دوسری جگہ واقع ہے ترک کر دینا چاہیے۔ اسلام کے نزدیک مادہ روح کی اس شکل کا نام ہے جس کا اظہار قیدِ مکانی و زمانی میں ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مغرب نے مادے اور روح کی ثنویت کا عقیدہ بلا کسی غور و فکر کے مانویت کے زیرِ اثر قبول کر لیا تھا۔ اگرچہ آج اس کے بہترین اربابِ فکر اپنی اس ابتدائی غلطی کو محسوس کر رہے ہیں مگر سیاست دانوں کا طبقہ ایک طرح سے اب بھی مصر ہے کہ دنیا اس اصول کو ایک ناقابلِ انکار حقیقت کے طور پر تسلیم کر لے۔ دراصل یہ روحانی اور دنیوی زندگی کا غلط امتیاز ہے جس سے مغرب کے سیاسی اور مذہبی افکار بیشتر طور پر متاثر ہوئے ہیں اور جس سے یورپ کی مسیحی ریاستوں نے عملاً مذہب سے کلیتہً علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ اس سے چند متفرق اور بے ربط سلطنتیں قائم ہو گئی ہیں جن پر کسی انسانی جذبے کی بجائے قومی اغراض کی حکمرانی ہے، مگر لطف یہ ہے کہ آج یہی سلطنتیں ہیں جو مسیحیت کے اخلاقی اور مذہبی عقائد کی پامالی کے بعد ایک متحد یورپ کا خواب دیکھ رہی ہیں۔ بالفاظِ دیگر ان کو ایک ایسے اتحاد کی ضرورت کا احساس ہو چلا ہے جو

کلیسا کے ماتحت انہیں حاصل تو تھا لیکن جن کو اخوت انسانی کے اس عالگیر تصور کی روشنی میں تعمیر کرنے کی بجائے جو مسیح علیہ السلام کے دل میں موجود تھا انہوں نے لوتھر کی تعلیمات کے زیر اثر تباہ و برباد کر دیا۔ بہرحال دنیائے اسلامی میں کسی لوتھر کا ظہور ممکن نہیں اس لئے کہ اسلام میں کلیسا کا کوئی ایسا نظام موجود نہیں جو ازمنہ متوسط کے مسیحی نظام سے مشابہ ہو اور لہٰذا جس کے توڑنے کی ضرورت پیش آئے۔ دنیائے اسلام کے پیش نظر ایک ایسا عالمگیر نظام سیاست ہے جس کی اساس وحی و تنزیل پر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ چونکہ ہمارے فقہاء کو ایک عرصہ دراز سے عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رہا اور وہ عہد جدید کی داعیات سے بالکل بیگانہ ہیں لہٰذا اس امر کی ضرورت ہے کہ ہم اس میں از سر نو قوت پیدا کرنے کے لئے اس کی ترکیب و تعمیر کی طرف متوجہ ہوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ بالآخر تصور قومیت کا انجام ملت اسلامیہ میں کیسا ہو گا۔ آیا اسلام اس تصور کو اپنے اندر جذب کر کے اس کو اسی طرح بدل دے گا جس طرح اس سے پیشتر اس نے اس سے بالکل مختلف تصورات کی ترکیب و نوعیت کو ہمہ تن بدل دیا تھا' یا یہ کہ اس سے خود اسلام کے اندر کوئی زبردست تغیر رونما ہو جائے گا۔ کچھ روز ہوئے پروفیسر ونسنگ (Wensing) نے مجھے لیڈن (ہالینڈ) سے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ اسلام نے اس وقت اس نازک دور میں قدم رکھا ہے جس میں داخل ہوئے مسیحیت کو ایک صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے۔ اس وقت سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ بہت سے قدیم تصورات کو ترک کر دینے کے باوجود مذہب کی بنیادوں کو تزلزل و انتشار سے محفوظ رکھنے کی صورت کیا ہے۔ پروفیسر موصوف کہتے ہیں کہ ابھی تو وہ اسی امر کا فیصلہ نہیں کر سکے کہ اس کا نتیجہ مسیحیت کے حق میں کیا ہو گا۔ اسلام کے متعلق کوئی پیشگوئی کرنا اور بھی ناممکن ہے۔ اس وقت قوم و وطن کے تصور نے مسلمانوں کی نگاہوں کو نسل و خون کے امتیاز میں الجھا رکھا ہے اور اسلام کے انسانیت پرور مقاصد میں عملاً حارج ہو رہا ہے ممکن ہے کہ یہ نسلی احساسات ترقی کرتے کرتے ان اصول و قواعد کے محرک ہوں جو تعلیمات اسلامی کے مخالف ہی نہیں بلکہ ان سے بالکل متضاد ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات اس خالص علمی بحث کے لئے مجھے معاف فرمائیں گے' لیکن آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لئے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو اس امر سے مایوس نہیں ہو گیا

ہے کہ اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے جو ذہن انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کر سکتی ہے۔ جس کا یہ عقیدہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور جسے یقین ہے کہ اسلام کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے۔ اسے کسی دوسری تقدیر کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا شخص مجبور ہے کہ جس معاملے پر بھی غور کرے اپنے نقطہ نظر کے ماتحت کرے۔ آپ یہ خیال نہ فرمائیے گا کہ جس مسئلے کی طرف میں نے اشارا کیا ہے وہ محض نظری حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک زندہ اور عملی سوال ہے جس سے بطور ایک دستور حیات اور نظام عمل کے اسلام کی ساری کائنات متاثر ہو سکتی ہے۔ صرف یہی ایک مسئلہ ہے جس کے صحیح حل پر اس امر کا دارومدار ہے کہ ہم لوگ آگے چل کر ہندوستان میں ایک ممتاز و متمیز تہذیب کے حامل بن سکیں۔ اسلام پر ابتلا و آزمائش کا کبھی ایسا سخت وقت نہیں آیا جیسا کہ آج درپیش ہے۔ ہر قوم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے بنیادی اصولوں کی ترمیم و تاویل کرے یا ان کو یک قلم منسوخ کر دے لیکن اس قسم کا قدم اٹھانے سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ اس کے نتائج و عواقب کیا ہوں گے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ جس انداز سے میں نے اس مسئلے پر نظر ڈالی ہے اس سے کسی شخص کو یہ غلط فہمی ہو کہ جن حضرات کو میرے خیالات سے اتفاق نہیں ہے میں ان سے پیکار و مناقشت کا دروازہ کھولنا چاہتا ہوں۔ یہ اجتماع مسلمانوں کا ہے جن کے متعلق مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے مقاصد اور اس کی تعلیمات پر قائم رہنے کے دل سے آرزومند ہیں۔ میرا مقصود صرف اس قدر ہے کہ موجودہ حالات کے متعلق میں نے جو رائے قائم کی ہے اس کا آزادی سے اظہار کر دوں۔ میرے نزدیک صرف یہی ایک صورت ہے اس امر کی کہ میں آپ کی سیاسی راہوں کو اپنے عقائد کی روشنی میں منور کر سکوں۔

قومیت ہند کا اتحاد

سوال یہ ہے کہ آج جو مسئلہ ہمارے پیش نظر ہے اس کی صحیح حیثیت کیا ہے؟ کیا واقعی مذہب ایک نجی معاملہ ہے اور آپ بھی یہ چاہتے ہیں کہ ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہوا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں لیکن اس کے نظام

سیاست کی بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان نہیں رہتا؟ ہندوستان میں یہ سوال اور بھی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ باعتبار آبادی ہم لوگ اقلیت میں ہیں۔ یہ دعویٰ کہ مذہبی واردات محض انفرادی اور ذاتی واردات ہیں اہل مغرب کی زبان سے تو عجب خیز معلوم نہیں ہوتا کیونکہ یورپ کے نزدیک مسیحیت کا تصور ہی یہی تھا کہ وہ ایک مشرب رہبانیت ہے جس نے دنیائے مادیات سے منہ موڑ کر اپنی تمام تر توجہ عالم روحانیت پر جما لی ہے۔ اس قسم کے عقیدے سے لازما وہی نتیجہ مترتب ہو سکتا تھا جس کی طرف اوپر اشارا کیا گیا ہے، لیکن آنحضرت ﷺ کے واردات مذہب کی حیثیت جیسا کہ قرآن پاک میں ان کا اظہار ہوا ہے اس سے قطعا مختلف ہے۔ یہ واردات محض حیاتی نوع کی واردات نہیں ہیں کہ ان کا تعلق صرف صاحب واردات کے اندرون ذات سے ہو لیکن اس سے باہر اس کے گرد و پیش کی معاشرت پر ان کا کوئی اثر نہ پڑے۔ بر عکس اس کے یہ وہ انفرادی واردات ہیں جن سے بڑے بڑے اجتماعی نظامات کی تخلیق ہوئی ہے اور جن کے اولین نتیجے سے ایک ایسے نظام سیاست کی تاسیس ہوئی جس کے اندر قانونی تصورات مضمر تھے اور جن کی اہمیت کو محض اس لئے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی بنیاد وحی و الہام پر ہے، لہٰذا اسلام کا مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نظام سے جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے الگ نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں، اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کا ترک بھی لازم آئے گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحے کے لئے بھی کسی ایسے نظام سیاست پر غور کرنے کے لئے آمادہ ہو گا جو کسی ایسے وطنی یا قومی اصول پر جو اسلام کے اصول اتحاد کی نفی کرے مبنی ہو۔ یہ وہ مسئلہ ہے جو آج مسلمانان ہندوستان کے سامنے ہے۔ مشہور فرانسیسی عالم رینان (Renan) کا قول ہے کہ "انسان نہ نسل کی قید گوارا کر سکتا ہے نہ مذہب کی، نہ دریاؤں کا بہاؤ اس کی راہ میں حائل ہو سکتا ہے، نہ پہاڑوں کی سمتیں اس کے دائرے کو محدود کر سکتی ہیں۔ اگر صحیح الدماغ انسانوں کا ایک زبردست اجتماع موجود ہے اور ان کے دلوں میں جذبات کی گرمی ہے تو انہی کے اندر وہ اخلاق شعور پیدا ہو جائے جسے ہم لفظ "قوم" سے تعبیر کرتے ہیں۔ مجھے اس قسم کی ترکیب و اجتماع سے انکار نہیں، اگرچہ یہ ایک نہایت ہی طویل و صبر آزما عمل ہے اس لئے اس کا مطلب انسان کی

زندگی کو عملاً ایک نئے سانچے میں ڈھالنا ہے اور اس کے جذبات و احساسات کی دنیا کو یکسر پلٹ دینا ہے۔ اگر اکبر کا دین الٰہی یا کبیر کی تعلیمات عوام الناس میں مقبول ہو جائیں تو ممکن تھا کہ ہندوستان میں بھی اس قسم کی ایک نئی قوم پیدا ہو جاتی لیکن تجربہ بتلاتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف مذاہب اور متعدد جاتیوں میں اس قسم کا کوئی رجحان موجود نہیں کہ وہ اپنی انفرادی حیثیت کو ترک کر کے ایک وسیع جماعت کی صورت اختیار کر لیں۔ ہر گروہ اور ہر مجموعہ مضطرب ہے کہ اس کی ہیئت اجتماعیہ قائم رہے۔ لہٰذا اس قسم کا اخلاقی شعور جو رینان کے لئے کسی قوم کی تخلیق کے لئے ناگزیر ہے ایک ایسی عظیم قربانی کا طالب ہے جس کے لئے ہندوستان کی کوئی جماعت تیار نہیں۔ قومیت ہند کا اتحاد ان تمام جماعتوں کی نفی میں نہیں بلکہ ان کے تعاون و اشتراک اور ہم آہنگی پر مبنی ہے۔ صحیح تدبر کا تقاضا ہے کہ ہم حقائق کا خواہ وہ کیسے بھی ناخوشگوار کیوں نہ ہوں اعتراف کریں۔ حصول مقاصد کی عملی راہ یہ نہیں ہے کہ ایک ایسی حالت کو فرض کر لیا جائے جو واقعتہً موجود نہ ہو۔ ہمارا طریق کار یہ ہونا چاہئے کہ ہم واقعات کی تکذیب کی بجائے ان سے جہاں تک ہو سکے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔ میری رائے میں ہندوستان اور ایشیا کی قسمت صرف اس بات پر مبنی ہے کہ ہم قومیت ہند کا اتحاد اسی اصول پر قائم کریں۔ اگر ہم ہندوستان کو چھوٹا سا ایشیا قرار دیں تو غیر مناسب نہ ہو گا۔ اہل ہند کا ایک حصہ ان قوموں سے ملتا جلتا ہے جو مغربی اور وسطی ایشیا میں آباد ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر ہندوستان کے اندر اشتراک و تعاون کی کوئی موثر راہ نکل آئی تو اس سے نہ صرف اس قدیم ملک میں جو اپنے باشندوں کی کسی طبیعی خرابی کی وجہ سے نہیں بلکہ محض اپنی جغرافی حیثیت کے باعث ایک عرصہ دراز سے مصائب و فتن کا تختہ مشق بن رہا ہے، صلح و آشتی قائم ہو جائے گی بلکہ اس کے ساتھ ہی تمام ایشیا کا سیاسی عقدہ بھی حل ہو جائے گا۔

با ایں ہمہ یہ امر کس قدر افسوس ناک ہے کہ اب تک ہم نے باہمی تعاون و اشتراک کی جس قدر کوششیں کی ہیں سب ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہماری ناکامی کا باعث کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شاید ہمیں ایک دوسرے کی نیتوں پر اعتماد نہیں اور باطناً ہم تغلب و اقتدار کے خواہش مند ہیں۔ یا یہ ممکن ہے کہ ہم اتحاد و تعاون کے مقاصد عالیہ کے لئے اتنا ایثار بھی نہیں کر سکتے کہ اب تک جو اجارات ہمیں کسی نہ

کسی طرح حاصل ہو گئے ہیں ان سے دستبردار ہو جائیں۔ ہم اپنی نفسانیت کو قومیت کے نقاب میں چھپاتے ہیں اور اگر ظاہری طور پر ہمیں ایک نہایت ہی روادارانہ حب الوطنی کا ادعا ہے لیکن دلوں میں ذات پات کی تنگی اور فرقہ آرائی کی ہوس بدستور کام کر رہی ہے۔ ہم لوگ اس اصول کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ہر جماعت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تہذیب و تمدن کے نشوونما میں آزادی کے ساتھ قدم بڑھائے' لیکن ہماری ناکامی کے اسباب کچھ بھی ہوں میرا دل اب بھی امید سے لبریز ہے۔ واقعات کا رجحان بہرکیف ہمارے داخلی اتحاد اور اندرونی ہم آہنگی ہی کی جانب نظر آتا ہے اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے مجھے یہ اعلان کرنے میں مطلق تامل نہیں اگر فرقہ وارانہ امور کے ایک مستقل اور پائدار تصفیے کے لئے اس بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانانِ ہندوستان کو اپنی روایات و تمدن کے ماتحت اس ملک میں آزادانہ نشوونما کا حق حاصل ہے تو وہ اپنے وطن کی آزادی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ یہ اصول کہ ہر فرد اور ہر جماعت اس امر کی مجاز ہے کہ وہ اپنے عقائد کے مطابق آزادانہ ترقی کرے کسی تنگ نظر فرقہ واری پر مبنی نہیں۔ فرقہ واری کی بھی بہت سی صورتیں ہیں۔ وہ فرقہ واری جو دوسری قوموں سے نفرت اور ان کی بدخواہی کی تعلیم دے اس کی ذلیل اور ادنیٰ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ میں دوسری قوموں کے رسوم و قوانین اور ان کے معاشرتی اور مذہبی ادارات کی دل سے عزت کرتا ہوں بلکہ بحیثیت مسلمان میرا یہ فرض ہے کہ اگر ضرورت پیش آئے تو احکام قرآنی کے حسب اقتضا میں ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کروں۔ بایں ہمہ مجھے اس جماعت سے دلی محبت ہے جو میرے اوضاع و اطوار اور میری زندگی کا سرچشمہ ہے اور جس نے اپنے دین اور اپنے ادب' اپنی حکمت اور اپنے تمدن سے بہرہ مند کر کے مجھے وہ کچھ عطا کیا جس سے میری موجودہ زندگی کی تشکیل ہوئی۔ یہ اسی کی برکت ہے کہ میرے ماضی نے از سر نو زندہ ہو کر مجھ میں یہ احساس پیدا کر دیا ہے کہ وہ آپ بھی میری ذات میں سرگرم کار ہے۔ نہرو رپورٹ کے واضعین تک نے بھی فرقہ واری کے اس بلند پہلو کا اعتراف کیا ہے۔ علیحدگی سندھ کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے :

"یہ کہنا قومیت کے وسیع نقطہ نگاہ کے ماتحت کسی فرقہ وارانہ صوبے کا قیام

مناسب نہیں بالکل ایسا ہے جیسے یہ دعویٰ کہ بین الاقوامی نصب العین کے سرگرم سے سرگرم حامیوں کو بھی اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ قوموں کی پوری پوری آزادی کے بغیر کسی بین الاقوامی ریاست کا وجود قائم کرنا مشکل ' ہے اسی طرح مکمل تمدنی آزادی کے بغیر اور یاد رکھئے کہ اپنی ارفع اور اعلیٰ صورت میں فرقہ واری سوائے تمدن کے اور کچھ نہیں' ایک ہم آہنگ اور متوازن قوم کا پیدا کرنا بھی ناممکن ہے۔"

ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان

لہٰذا ثابت ہوا کہ ہندوستان میں ایک متوازن اور ہم آہنگ قوم کے نشو و نما کے لئے مختلف ملتوں کا وجود ناگزیر ہے۔ مغربی ممالک کی طرح ہندوستان کی یہ حالت نہیں کہ اس میں ایک ہی قوم آباد ہو۔ وہ ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہو اور اس کی زبان بھی ایک ہو۔ ہندوستان مختلف اقوام کا وطن ہے جن کی نسل' زبان' مذہب سب ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ان کے اعمال و افعال میں وہ احساس پیدا ہی نہیں ہو سکتا جو ایک ہی نسل کے مختلف افراد میں موجود رہتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ہندو بھی تو کوئی واحد الجنس قوم نہیں۔ پس یہ امر کسی طرح بھی مناسب نہیں نہ مختلف ملتوں کے وجود کا خیال کئے بغیر ہندوستان میں مغربی اصول جمہوریت پر عمل کرنا شروع کر دیا جائے۔ مسلمانوں کا یہ مطالبہ بالکل بجا ہے کہ وہ ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان قائم کریں۔ میری رائے میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قراردادوں سے اسی بلند نصب العین کا اظہار ہوتا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ مختلف ملتوں کے وجود کو فنا کئے بغیر ان سے ایک متوافق اور ہم آہنگ قوم تیار کی جائے تاکہ وہ آسانی کے ساتھ اپنے ان ممکنات کو جو ان کے اندر مضمر ہیں عمل میں لا سکیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اجتماع ان تمام مطالبات کی جو اس قرارداد میں موجود ہیں نہایت شدومد سے تائید کرے گا۔ ذاتی طور پر میں ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ پنجاب' صوبہ سرحدی' سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے' خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خوداختیاری حاصل کرے خواہ اس کے باہر۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو آخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی۔ اس تجویز کو نہرو کمیٹی میں بھی پیش کیا گیا تھا لیکن اراکین مجلس نے اسے اس بنیاد پر رد کر

دیا کہ اگر اس قسم کی کوئی ریاست قائم ہوئی تو اس کا رقبہ اس قدر وسیع ہو گا کہ اس کا انتظام کرنا دشوار ہو جائے گا۔ بے شک اگر رقبے کا لحاظ کیا جائے تو اراکین مجلس کا یہ خیال صحیح ہے لیکن آبادی پر نظر کی جائے تو اس ریاست کے باشندوں کی تعداد اس وقت کے بعض ہندوستانی صوبوں سے بھی کم ہو گی۔ غالباً قسمت انبالہ یا اس قسم کے دوسرے اضلاع کو الگ کر دینے سے، جن میں ہندو آبادی کا غلبہ ہے اس کی وسعت اور انتظامی مشکلات میں اور بھی کمی ہو جائے گی۔ پھر ان اضلاع کی علیحدگی سے غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کہیں زیادہ محفوظ ہو جائیں گے۔ اس تجویز کو سن کر نہ انگریزوں کو پریشان ہونا چاہیے نہ ہندوؤں کو۔ ہندوستان دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علقے میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے اس زندہ اور جاندار طبقے کی مرکزیت کی بدولت جس نے دولت برطانیہ کی ناانصافیوں کے باوجود فوج اور پولیس میں شریک ہو کر انگریزوں کو اس قابل بنایا ہے کہ وہ اس ملک میں اپنی حکومت قائم رکھیں، ہندوستان ہی کا مسئلہ حل نہیں ہو جائے گا بلکہ اس سے خود مسلمانوں کے احساسات ذمہ داری قوی ہو جائے گی اور ان کا جذبہ حب الوطنی بڑھ جائے گا۔ اگر شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو اس امر کا موقعہ دیا گیا کہ وہ ہندوستان کے جسد سیاسی کے اندر رہ کر اپنے نشو و ارتقاء میں آزادانہ قدم اٹھا سکیں تو وہ تمام بیرونی حملوں کے خلاف، خواہ وہ حملہ بزور قوت ہو یا بزور خیالات، ہندوستان کے بہترین محافظ ثابت ہوں گے۔ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی ۵۶ فیصدی ہے لیکن ہندوستان کی پوری فوج میں ہمارا حصہ ۵۴ فیصدی ہے اور اگر عساکر ہند کی کل تعداد میں سے ان ۱۹ ہزار گورکھوں کو جو نیپال کی آزاد ریاست سے بھرتی کئے جاتے ہیں، نکال دیا جائے تو مسلمانوں کی تعداد ۶۲ فیصدی ہو جائے گی، حالانکہ اس اندازے میں وہ چھ ہزار جنگجو شامل نہیں جو بلوچستان اور صوبہ سرحد سے بھرتی کئے جاتے ہیں۔ اس سے آپ ان تمام صلاحیتوں کا بآسانی اندازہ کر سکیں گے جو شمال مغربی ہندوستان کی مسلم آبادی میں موجود ہیں اور جن کی بدولت وہ تمام ہندوستان کو غیر ملکی چیرہ دستیوں سے محفوظ و مامون رکھ سکتی ہے۔ رائٹ آنریبل مسٹر سری نواس شاستری کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ شمال مغربی سرحد کے ساتھ ساتھ خود مختار

اسلامی ریاستیں قائم کی جائیں ان کی اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ اگر ضرورت پیش آئے تو حکومت ہند پر زور ڈالا جا سکے۔ میں عرض کروں گا کہ مسلمانان ہندوستان کے دل میں اس قسم کا کوئی جذبہ موجود نہیں۔ ان کا مدعا صرف اس قدر ہے کہ وہ اپنی ترقی کی راہ میں آزادی کے ساتھ قدم بڑھائیں لیکن یہ اس مرکزی حکومت کے ماتحت ممکن نہ ہوگا جسے قوم پسند ہندو ارباب سیاست محض اس لئے قائم کرنا چاہتے ہیں کہ ان کو دوسری ملتوں پر ہمیشہ کے لئے غلبہ حاصل ہو جائے۔

بہرحال ہندوؤں کے دل میں اس قسم کا کوئی خدشہ نہیں ہونا چاہئے کہ آزاد اسلامی ریاستوں کے قیام سے ایک طرح کی مذہبی حکومت قائم ہو جائے گی۔ میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ اسلام میں مذہب کا مفہوم کیا ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام کوئی کلیسائی نظام نہیں بلکہ یہ ایک ریاست ہے جس کا اظہار روسو سے بھی کہیں پیشتر ایک ایسے وجود میں ہوا جو عقد اجتماعی کا پابند ہو۔ ریاست اسلامی کا انحصار ایک اخلاقی نصب العین پر ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان شجر و حجر کی طرح کسی خاص زمین سے وابستہ نہیں بلکہ وہ ایک روحانی ہستی ہے جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصہ لیتا ہے اور اس کے ایک زندہ جزو کی حیثیت سے چند فرائض اور حقوق کا مالک ہے۔ اسلامی ریاست کی نوعیت کا اندازہ ٹائمز آف انڈیا کے اس افتتاحیہ سے کیا جا سکتا ہے جس میں لکھا ہے کہ قدیم ہندوستان میں ریاست کا یہ فرض تھا کہ وہ سود کے متعلق قوانین بنائے لیکن باوجود اس کے کہ اسلام میں سود لینا حرام ہے اسلامی حکومت نے شرح سود پر کوئی پابندیاں عائد نہیں کیں۔ میں صرفِ ہندوستان اور اسلام کے فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازن قوت کی بدولت امن و امان قائم ہو جائے گا اور اسلام کو اس امر کا موقعہ ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گی۔

فیڈرل ریاستیں

میرے خیال میں اب یہ حقیقت اچھی طرح سے واضح ہو گئی ہے کہ اگر ہم ہندوستان میں آئندہ حکومت کے لئے کسی مستقل دستور کی بنا رکھنا چاہتے ہیں تو ہندوستان کے جغرافی' نسلی' لسانی اور عقائد و معاشرت کے اختلافات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسی آزاد ریاستیں قائم کر دیں جو زبان' نسل' تاریخ' مذہب اور اقتصادی مفاد کے اشتراک پر مبنی ہوں۔ سائمن رپورٹ کے اندر فیڈریشن کا جو تصور قائم کیا گیا ہے اس کے ماتحت بھی ضروری ہے کہ مرکزی مجلس وضع قوانین کا انتخاب عوام سے عمل میں نہ آئے بلکہ وہ فیڈرل ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل ہو۔ سائمن رپورٹ کی رو سے تقریباً انہی اصولوں کی بنا پر جن کا اظہار میں نے کیا ہے صوبوں کی تقسیم بھی از سر نو ہو جانی چاہئے۔ میں ان دونوں تجاویز کی دل سے تائید کرتا ہوں بلکہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی عرض کروں گا کہ صوبوں کی جدید تقسیم سے بیشتر دو شرطوں کا پورا ہو جانا ضروری ہے' اولاً یہ تقسیم نئے دستور کے اجراء سے پہلے مکمل ہو جانی چاہئے' ثانیاً اس کی نوعیت ایسی ہو کہ اس سے فرقہ وارانہ مسائل ہمیشہ کے لئے طے ہو جائیں۔ اگر صوبوں کی تقسیم کسی صحیح اصول کی بنا پر ہو گئی تو اس سے مخلوط اور جداگانہ انتخابات کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو جائے گا۔ میری رائے میں اس سارے جھگڑے کی بنا صوبوں کی موجودہ تقسیم پر ہے۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ جداگانہ انتخابات کا اصول قومیت کے منافی ہے۔ ان کے نزدیک لفظ قومیت کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ ہندوستان کے تمام باشندے باہم اس طرح خلط ملط ہو جائیں کہ ان کے اندر کسی مخصوص ملت کا انفرادی وجود باقی نہ رہے' لیکن ہندوستان کی یہ حالت نہیں۔ نہ ہم اس کے آرزو مند ہیں۔ ہندوستان میں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کی معاشی پستی' ان کی بے حد مقروضیت (بالخصوص پنجاب میں) اور بعض صوبوں میں ان کی ناکافی اکثریتوں کا بھی خیال کر لیا جائے تو آپ کی سمجھ میں آ جائے گا کہ مسلمان جداگانہ انتخابات کے لئے کیوں مضطرب ہیں۔ ہندوستان جیسے ملک میں اور خاص طور پر ان حالات میں جو اس وقت یہاں ہیں اس امر کی توقع رکھنا کہ علاقہ وارانہ انتخابات سے ہر ملت کے مفاد کی پوری پوری نمائندگی ہو سکے گی ناممکن ہے سوائے اس کے کہ تمام اقلیتوں پر ہندوؤں کا تغلب قائم ہو جائے' لیکن اگر

صوبوں کی تقسیم کسی ایسے اصول کے ماتحت عمل میں آجائے کہ ہر صوبے کے اندر تقریباً ایک ہی طرح کی ملتیں بستی ہوں اور ان کی نسل' ان کی زبان' ان کا مذہب اور ان کی تہذیب و تمدن ایک ہو تو مسلمانوں کو مخلوط انتخابات پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔

سائمن رپورٹ اور فیڈریشن

لیکن جہاں تک مرکزی فیڈرل ریاست کے اختیارات کا تعلق ہے ہندو اور انگریز پنڈتوں نے جو دستور طیار کیا ہے اس سے اس باریک اختلاف کا صاف پتہ چل جاتا ہے جو ان دونوں کے مقاصد میں موجود ہے۔ ہندوستان کے پنڈتوں کو یہ منظور نہیں کہ مرکزی حکومت کے موجودہ اختیارات میں سر مو بھی فرق آئے۔ ان کا مطالبہ صرف اس قدر ہے کہ ان اختیارات کو مجلس وضع قوانین کی رضامندی پر چھوڑ دیا جائے جس میں اس وقت بھی انہی کی کثرت ہے اور جب اراکین کی نامزدگی کا طریق ختم ہوا تو یہ کثرت اور بھی زیادہ ہو جائے گی۔ اس کے برعکس انگلستان کے پنڈتوں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اگر مرکزی حکومت میں اصول جمہوریت کا اطلاق ہو گیا تو اس کا نتیجہ ان کے مفاد کے خلاف ہو گا کیونکہ مزید اختیارات مل جانے پر تمام قوت ان کے ہاتھوں سے نکل جائے گی۔ یہ طے کیا ہے کہ وہ اپنے اصول جمہوریت کا تجربہ مقامی حکومتوں میں کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے فیڈریشن کے اصول پر عمل کرنے کا خیال ظاہر کیا ہے بلکہ اس کے متعلق کچھ تجاویز بھی پیش کر دی ہیں' لیکن انہوں نے اس اصول پر جس پہلو سے غور کیا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے جو مسلمانان ہند کے پیش نظر ہے۔ مسلمانوں نے فیڈریشن کا مطالبہ محض اس لئے کیا ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلے کے تصفیے کی صرف یہی ایک صورت ہے۔ برخلاف اس کے شاہی کمیشن کے ارکان کے ذہن میں فیڈریشن کا جو تصور ہے وہ اصولی طور سے کس قدر بھی درست اور مستحکم کیوں نہ ہو اس سے فیڈرل ریاستوں میں کسی خود اختیاری حکومت کا قائم ہونا مشکل ہے۔ ان کی غرض صرف اس قدر ہے کہ اصول جمہوریت کے نفوذ سے ہندوستان میں جو صورت حالات پیدا ہو گئی ہے اس سے فرار کی کوئی راہ نکل آئے۔ فرقہ وارانہ مسئلے پر انہوں نے کوئی غذر نہیں کیا بلکہ اسے ویسے ہی چھوڑ دیا ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک حقیقی فیڈریشن کا تعلق ہے سائمن

رپورٹ کی تجاویز نے اس کی پوری پوری نفی کر دی۔ نہرو رپورٹ نے محض اس امر کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ مرکزی مجلس وضع قوانین میں ہندوؤں کی اکثریت ہے وحدتی نظام کی سفارش کی کیونکہ اس سے تمام ہندوستان پر بآسانی ہندوؤں کا تغلب قائم ہو جاتا ہے۔ سائمن رپورٹ نے محض ایک لفظی فیڈریشن کی اسکیم پیش کی ہے جس کی تہہ میں برطانیہ کا اقتدار بدستور قائم رہے گا۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ انگریز طبعاً اس اقتدار سے دستبردار ہونا پسند نہیں کرتے جو اب تک انہیں حاصل رہا ہے اور کچھ یہ کہ اگر فرقہ وارانہ مسئلے کا تصفیہ نہ ہو سکا تو ان کو ہندوستان پر مستقلاً اپنا قبضہ رکھنے کے لئے ایک اچھا عذر مل جائے گا۔ میں تو اس امر کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ہندوستان میں وحدتی حکومت قائم ہو۔ جن اختیارات کو ''فاضل'' (Residuary) کہا جاتا ہے وہ صرف آزاد ریاستوں کو ملنا چاہئے۔ مرکزی فیڈرل ریاست کے ذمہ صرف ایسے اختیارات رہنا چاہئے جو تمام فیڈرل ریاستیں بطیبِ خاطر اس کے سپرد کر دیں۔ میں مسلمانانِ ہندوستان کو کبھی یہ رائے نہیں دوں گا کہ وہ کسی ایسے نظام حکومت سے خواہ وہ برطانوی ہو یا ہندی اظہار اتفاق کریں جو حقیقی فیڈریشن کے اصول پر مبنی نہ ہو یا جس میں ان کے جداگانہ سیاسی وجود کو تسلیم نہ کیا جائے۔

فیڈرل اسکیم اور راؤنڈ ٹیبل کانفرنس

پیشتر اس کے کہ انگریز مرکزی حکومت میں اساسی تبدیلی کے لئے کوئی موثر ذریعہ پیدا کرتے اس امر کو محسوس کر لیا گیا تھا کہ اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آخر الامر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں والیان ریاست کی شمولیت کو بھی ضروری قرار دیا گیا۔ اس سے باشندگان اور بالخصوص اقلیتوں کو بجا طور پر تعجب ہوا کہ والیان ریاست نے کس قدر تیزی کے ساتھ اپنی رائے بدل لی اور ہندوستان کے فیڈریشن میں شامل ہونے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ہندوؤں نے بھی جو اب تک وحدتی حکومت کے طرف دار چلے آتے تھے بغیر کسی تکلف کے فیڈریشن کے اصول سے اتفاق کر لیا' ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے جب مسٹر شاستری نے سرجان سائمن کی فیڈریشن والی اسکیم پر نہایت سختی سے نکتہ چینی کی تھی لیکن وہ بھی دفعتہً فیڈریشن پر رضامند ہو گئے اور اپنی اس رضامندی کا اظہار کانفرنس کے ابتدائی اجلاس میں ہی کر دیا۔ جس سے

وزیر اعظم انگلستان کو موقعہ ملا کہ وہ اپنی آخری تقریر میں چند نہایت ہی برجستہ اشارات کر سکیں۔ یہ سب کچھ خالی از علت نہیں۔ انگریزوں نے والیان ریاست کو فیڈریشن میں شریک ہونے کی دعوت دی اور ہندو چپ چاپ اس پر رضامند ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ والیان ریاست کی شرکت سے جن میں مسلمانوں کی تعداد نہایت کم ہے دو مقصد حاصل ہوتے ہیں' ایک طرف وہ ہندوستان پر برطانوی اقتدار کے تسلسل میں مدد دیں گے' دوسری طرف ہندوؤں کو فیڈرل اسمبلی میں انکی بدولت اکثریت حاصل ہو جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ مرکزی حکومت کی شکل کے متعلق ہندو اور مسلمانوں میں جو اختلاف موجود ہے انگریز مدبرین والیان ریاست کے ذریعے نہایت چالاکی کے ساتھ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ خود والیان ریاست بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس اسکیم کے ماتحت ان کی مستبدانہ حکومت اور بھی زیادہ مضبوط ہو جائے گی۔ اگر مسلمانوں نے اس اسکیم کو خاموشی کے ساتھ منظور کر لیا تو ان کا سیاسی وجود تھوڑے ہی عرصے میں کالعدم ہو جائے گا' کیونکہ اس قسم کے فیڈریشن میں ہندو والیانِ ریاست کی اکثریت ہو گی اور وہی حکومت کے سیاہ و سفید کے مالک ہوں گے۔ اگر دولت برطانیہ کے مفاد کا سوال درپیش ہو گا تو وہ حکومت انگلستان کا ساتھ دیں گے لیکن جہاں تک ملک کے اندرونی نظم و نسق کا تعلق ہے وہ ہندوؤں کا تسلط اور اقتدار قائم رکھیں گے۔ بالفاظ دیگر یہ اسکیم برطانوی حکومت اور ہندو ہندوستان کے درمیان ایک قسم کی مفاہمت ہے یعنی اگر تم میرا اقتدار ہندوستان پر قائم رکھو تو میں تمہیں ایک ایسی حکومت قائم کرنے میں مدد دوں گا جس میں تمہارا یعنی ہندوؤں کا غلبہ ہو گا۔ لہٰذا اگر برطانوی ہندوستان کے تمام صوبے حقیقتاً خود مختار ریاستوں کی صورت اختیار نہ کر لیں تو پھر فیڈریشن میں والیان ریاست کی شرکت کا مطلب صرف اسی قدر ہو سکتا ہے کہ انگریز مدبرین اپنے اختیارات سے دستبردار ہوئے بغیر نہایت چالاکی کے ساتھ تمام جماعتوں کو خوش کر دینا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کو لفظ فیڈریشن' ہندوؤں کو مرکز میں اکثریت اور انگریز حامیان سلطنت کو خواہ وہ ٹوری جماعت سے ہوں یا مزدور سے' حقیقی اختیارات کی قوت سے۔

ہندوستان میں ہندو ریاستوں کی تعداد اسلامی ریاستوں سے کہیں زیادہ ہے لہٰذا یہ دیکھنا باقی ہے کہ مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ انہیں مرکزی فیڈرل اسمبلی میں ۳۳

فیصدی نشستیں حاصل ہوں اس ایک ایوان یا ایوانات میں کیونکر پورا کیا جائے گا جو دیسی ریاستوں اور برطانوی ہندوستان دونوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمان مندوبین فیڈرل حکومت کے اس مفہوم کو اچھی سمجھتے ہیں جیسا کہ کانفرنس میں اس پر غور و خوض ہو رہا ہے۔ ابھی آل انڈیا فیڈریشن میں مسلمانوں کی نیابت کا مسئلہ پیش نہیں آیا، البتہ رائٹر سے مختصراً یہ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ اس وقت جو رپورٹ پیش ہوئی ہے اس میں دو ایوانوں کی سفارش کی گئی ہے۔ جن میں برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں کے نمائندے شریک ہوں گے لیکن ان کی تعداد کے مسئلے پر اس وقت بحث ہو گی جب کمیٹی ان عنوانات پر غور کرے گی جن کو ابھی سب کمیٹی کے ذمہ نہیں کیا گیا۔ میری رائے میں تناسب کا سوال نہایت اہم ہے اور بہتر ہوتا کہ اسمبلی کی ہیئت ترکیبی کے ساتھ اس پر بھی بحث ہو جاتی۔

میرے نزدیک سب سے بہتر صورت یہ تھی کہ ابتدا میں فیڈریشن صرف برطانیہ علاقے تک محدود رہتا، کسی ایسی فیڈرل اسکیم سے بھی جو استبداد اور جمہوریت کے ناپاک اتحاد پر مبنی ہو سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ مترتب ہو سکتا کہ برطانوی ہندوستان بدستور وحدتی حکومت کا تختہ مشق بنا رہے۔ یہ وحدتی حکومت ممکن ہے کہ انگریزوں کے لئے مفید ہو اور والیان ریاست اور اکثریت کے لئے بھی۔ لیکن اس سے مسلمانوں کے لئے فائدے کی کوئی توقع رکھنا بے سود ہے جب تک کہ انہیں ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے پانچ میں پورے پورے "فاضل" اختیارات کے ساتھ اکثریت کے حقوق حاصل نہ ہو جائیں اور مرکزی فیڈرل اسمبلی کی کل تعداد میں انہیں ۳۳ فیصدی نشستیں نہ ملیں۔ جہاں تک کہ برطانوی ہند کے صوبوں کے لئے حاکمانہ (Sovereign) اختیارات کا تعلق ہے ہزہائینس نواب بھوپال، سر اکبر حیدری اور مسٹر جناح کا رویہ سراسر حق بجانب ہے۔ چونکہ اب والیان ریاست بھی فیڈریشن میں شریک ہو رہے ہیں لہذا مرکزی مجلس کے متعلق ہمیں اپنے مطالبے کو نئی شکل میں پیش کرنا چاہئے۔ اب یہ مسئلہ محض برطانوی ہند کی اسمبلی میں تناسب کا نہیں رہا بلکہ اب سوال آل انڈیا فیڈریشن سے مسلمانوں کی نمائندگی کا ہے۔ ہمارا مطالبہ یہ ہونا چاہئے کہ ان اسلامی ریاستوں کے علاوہ جو فیڈریشن میں شریک ہوں ہمیں تمام فیڈریشن میں $\frac{1}{3}$ نشستیں حاصل ہوں۔

مسئلہ دفاع

ہندوستان میں فیڈرل نظام قائم کرنے میں ایک بہت بڑی دقت دفاع و حفاظت کی ہے۔ شاہی کمیشن کے ارکان نے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے تمام نقائص کو پیش نظر رکھ لیا ہے تاکہ جنگی نظم و نسق کی باگ ہمیشہ دولت برطانیہ کے ہاتھ میں رہے۔ انہوں نے لکھا ہے :

"ہندوستان اور برطانیہ کا تعلق کچھ ایسا ہے کہ ہندوستان کے مسئلہ دفاع کو نہ اب نہ مستقبل قریب میں محض ہندوستانی مسئلہ تصور کیا جا سکتا ہے۔ دفاعی عساکر کا نظم و نسق ہمیشہ نائبین سلطنت کے ہاتھوں میں رہنا چاہئے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہئے کہ جب تک برطانوی افواج اور برطانوی افسروں کی مدد کے بغیر ہندوستانی اپنی سرحدوں کی حفاظت کے قابل نہ ہو جائیں' برطانوی ہندوستان میں ذمہ دارانہ حکومت قائم نہیں ہو سکتی؟ موجودہ حالات میں اس امر سے انکار کرنا مشکل ہے کہ یہ واقعی ہندوستان کی آئینی ترقی کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے۔ اگر نہرو رپورٹ کے اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ جب کبھی ہندوستان کو مزید اختیارات حاصل ہوں ان کا مطلب یہ بھی ہو گا کہ فوجوں کا نظم و نسق ہندوستان کی منتخبہ مجلس وضع قوانین کے ماتحت ہو تو وہ تمام امیدیں جو اس امر سے وابستہ ہیں کہ مرکزی حکومت بتدریج اس منزل کی طرف بڑھے جس کا اعلان ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء میں ہوا تھا معرضِ خطر میں آجائے گی۔"

اپنے بیان کی مزید تائید کے لئے ارکان کمیشن نے آگے چل کر اس امر پر خاص زور دیا ہے کہ ہندوستان میں مختلف مذاہب اور مختلف نسلوں کے درمیان جن کی صلاحیتیں اور قوتیں ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ رہیں' ایک تصادم رونما ہے۔ پھر یہ کہہ کر اس مسئلے کو اور بھی زیادہ پیچیدہ بنانے کی کوشش کی ہے کہ :

"یہ حقیقت کہ ہمارے عام اور مروجہ الفاظ میں ہندوستانی ایک قوم نہیں ہیں اور یہ بھی عیاں ہو جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کی جنگجو قوموں اور دوسری نسلوں میں کس قدر فرق موجود ہے۔"

اس مسئلے کے ان پہلوؤں پر زور دینے کا مقصد یہ ہے کہ انگریز صرف بیرونی حملوں ہی سے ہندوستان کی حفاظت نہیں کر رہے ہیں بلکہ وہ اس کے اندرونی امن و

سکون کے بھی "غیر جانبدار محافظ" ہیں۔ بہر حال فیڈریشن میں' جیسا کہ میں اس کا مطلب سمجھتا ہوں' اس مسئلے کا صرف ایک پہلو باقی رہ جائے گا یعنی ہندوستان کے خارجی تحفظ کا۔ صوبجاتی عساکر کے علاوہ جو ہندوستان کے اندرونی امن و سکون کے لئے ناگزیر ہیں' ہندوستان کی فیڈرل کانگریس صوبہ سرحدی میں ایک طاقتور سرحدی لشکر متعین کر سکتی ہے جس میں ہر صوبے کے سپاہی شامل ہوں گے اور جن کی قیادت ہر ملت کے آزمودہ کار افسروں کے ہاتھ میں ہو گی۔ مجھے اس امر کا بخوبی احساس ہے کہ ہندوستان میں قابل فوجی افسر موجود نہیں اور یہی چیز ہے جس سے فائدہ اٹھا کر ارکان کمیشن یہ کہتے ہیں کہ افواج کا نظم و نسق دولت برطانیہ کے ہاتھوں میں ہونا چاہئے' لیکن میں ان کے متعلق انہی کی رپورٹ سے ایک اقتباس پیش کروں گا جس سے خود ان کا انداز قابل اعتراض نظر آتا ہے :

"اس وقت کوئی ہندوستانی جسے ملک معظم کی طرف سے کمیشن ملا ہو کپتان سے اونچے عہدے پر فائز نہیں۔ ہندوستانی کپتانوں کی کل تعداد ۳۹ ہے جن میں ۲۵ معمولی رجمنٹوں میں کام کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض کی عمر اس قدر زیادہ ہے کہ اگر وہ ضروری امتحانات میں کامیاب بھی ہو جائیں جب بھی انہیں اس سے اونچا عہدہ حاصل نہیں ہو سکے گا۔ ان کا اکثر حصہ سینڈ ھرسٹ نہیں گیا بلکہ انہیں جنگِ عظیم میں کمیشن ملا تھا۔ اب یہ خواہش کہ صورت حالات میں تغیر پیدا کیا جائے کس قدر تدریجی کیوں نہ ہو اور اس کے لئے کیسی بھی مخلصانہ کوشش کیوں نہ کی جائے وہ شرائط جن کو اس کمیٹی نے (جس کے صدر اور فوجی سیکرٹری کے علاوہ تمام اراکین ہندوستانی تھے) نہایت موثر طریق پر لفظ "ترقی"...... میں جمع کر دیا ہے اس امر پر منحصر ہیں کہ ہر مرحلے پر کامیابی حاصل ہو اور جنگی قابلیت بدستور قائم رہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے ترقی کی رفتار لازماً سست رہے گی۔ موجودہ ہندوستانی افسر معمولی عہدوں پر کام کرتے ہیں اور ان کا تجربہ محدود ہے لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ وہ ایک قلیل عرصے کے اندر اعلیٰ مراتب حاصل کر لیں' جب تک ہندوستانی امیدواروں کی قلیل جماعت میں اضافہ نہ ہو جائے اور ہم اس اضافہ کے دل سے خواہش مند ہیں' جب تک ہندوستانیوں کی ایک کافی تعداد اس قدر تجربہ اور مہارت حاصل نہ کر لے کہ جس سے سب نہیں تو کم از کم کچھ رجمنٹوں کے تمام افسر

صرف ہندوستانی ہوں، جب تک یہ رجمنٹیں عملاً اس آزمائش میں کامیاب نہ ہو جائیں جو ان کی قابلیت کا اندازہ کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہے اس وقت تک یہ ممکن نہ ہو گا کہ فوج کے نظم و نسق کو ہندوستانیوں کے ذمہ سپرد کر دیا جائے اور یہ عمل اس حد تک پہنچ جائے کہ ساری فوج کلیہ ہندوستانی ہو جائے۔ اس حالت میں بھی اس کام کی تکمیل کے لئے سالہا سال کی ضرورت ہو گی۔"

اب میں یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ اس صورت حالات کا ذمہ دار کون ہے؟ اس کی وجہ ہماری جنگجو قوموں کی کوئی فطری خرابی ہے یا فوجی تعلیم کی سستی یا رفتار؟ ہماری جنگجو قوموں کی صلاحیت مسلمہ ہے البتہ یہ ممکن ہے کہ بہ نسبت تعلیم کے دوسرے شعبوں کے، جنگی تعلیم کا عمل ست ہو۔ میں عسکریات کا ماہر نہیں لیکن ایک عام آدمی کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں کہ اس دلیل کو جن انداز میں پیش کیا گیا ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ عمل ہمیشہ جاری رہے گا۔ گویا ہندوستان کی غلامی کبھی ختم نہیں ہو گی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ نہرو رپورٹ کی تجویز کے مطابق سرحدی افواج کا نظم و نسق ایک دفاعی کمیٹی کے ذمے کر دیا جائے اور اس کے ارکان کا فیصلہ باہمی تصفیے سے ہو۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ سائمن رپورٹ میں ہندوستان کی بری سرحدوں کو تو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے لیکن اس کے بحری تحفظ کے متعلق صرف سرسری اشارات کئے گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان پر ہمیشہ خشکی کے راستے سے حملے ہوتے رہے ہیں لیکن یہ امر بھی مسلم ہے کہ ہندوستان کے موجودہ حاکم اس کے غیر محفوظ سواحل ہی کی وجہ سے اس پر قابض ہوئے تھے۔ ایک آزاد اور خود مختار ہندوستان کے لئے ازبس ضروری ہے کہ وہ خشکی کی بجائے اپنی بحری سرحدوں کی زیادہ حفاظت کرے۔

مجھے یقین ہے کہ فیڈرل ریاست قائم ہو گئی تو مسلم فیڈرل ریاستیں ہندوستان کے تحفظ کی خاطر ایک غیر جانبدار ہندوستانی فوج کے قیام کے لئے جو خشکی اور سمندر دونوں پر متعین ہوں، ہر قسم کی مدد دینے پر آمادہ ہوں گی۔ مغلوں کے زمانے میں اس قسم کے غیر جانبدار عساکر واقعۃً موجود تھے بلکہ اکبر کے زمانے میں تو ان تمام سرحدی افواج کے افسر ہندو ہی تھے۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر فیڈرل نظام حکومت میں ایک غیر جانبدارانہ ہندوستانی لشکر قائم ہوا تو اس سے مسلمانوں کے جذبات حب الوطنی اور

زیادہ قوی ہو جائیں گے اور اس بدگمانی کا بھی ازالہ ہو جائے گا کہ اگر باہر سے کوئی حملہ ہوا تو مسلمانان ہندوستان اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ مل جائیں گے۔

اسلامی مطالبات

میں نے مختصراً اس امر کی وضاحت کر دی ہے کہ ہندوستان کے دو آئینی مسئلوں کے متعلق ہم مسلمانوں کو کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے۔ ہمارا سب سے بڑا مطالبہ یہ ہے کہ فرقہ وارانہ مسائل کے مستقل تصفیہ کے لئے برطانوی ہندوستان میں صوبوں کی تقسیم از سر نو ہو جائے لیکن اگر مسلمانوں کا یہ مطالبہ مسترد کر دیا جائے تو پھر میں نہایت شدومد کے ساتھ ان مطالبات کی تائید کروں گا جن کا اعلان آل انڈیا مسلم کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ میں بار بار کیا گیا ہے۔ مسلمانانِ ہندوستان کسی ایسی آئینی تبدیلی کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے جس کے ماتحت وہ بنگال اور پنجاب میں جداگانہ انتخابات کے ذریعے اپنی اکثریت حاصل نہ کر سکیں یا مرکزی مجلس میں انہیں ۳۳ فیصدی نشستیں نہ مل جائیں۔ اب تک مسلمانوں کے سیاسی رہنما دو گڑھوں میں گر چکے ہیں، پہلا گڑھا لکھنؤ کا مسترد شدہ میثاق ہے جسے قومیت ہند کے غلط تصور پر مرتب کیا گیا تھا اور جس کے ماتحت مسلمان ان تمام مواقع سے محروم رہ جاتے تھے کہ وہ اس ملک میں کوئی سیاسی طاقت پیدا کر سکیں، دوسرا گڑھا پنجاب کی نام نہاد دیہاتی آبادی کی خاطر اسلامی اتحاد واتفاق کی وہ ناعاقبت اندیشانہ قربانی ہے جس کا اظہار ایک ایسی تجویز میں ہوا ہے جس سے پنجاب کے مسلمان اقلیت میں رہ جاتے ہیں۔ لیگ کا فرض ہے کہ وہ میثاق کی اور اس تجویز دونوں کی مذمت کرے۔

سائمن رپورٹ نے مسلمانوں کے ساتھ ایک بہت بڑی ناانصافی کی ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے بنگال اور پنجاب میں ان کے لئے ایک آئینی اکثریت کی سفارش نہیں کی۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ مسلمان یا تو میثاق لکھنؤ کے پابند رہیں یا مخلوط انتخابات کو اختیار کر لیں۔ حکومت ہند نے سائمن رپورٹ کے متعلق جو یادداشت بھیجی ہے اس میں امر کا اعتراف کیا گیا ہے کہ رپورٹ کی اشاعت کے بعد مسلمانوں نے ان دونوں تجویزوں میں سے کسی ایک کو بھی پسند نہیں کیا۔ یادداشت میں لکھا ہے کہ مسلمانوں کی یہ شکایت بجا ہے کہ انہیں بنگال اور پنجاب میں تناسب آبادی کے لحاظ سے نمائندگی کا حق کیوں نہ

دیا گیا۔ محض یہ امر کہ ان کو دوسرے صوبوں میں "پاسنگ" حاصل ہے اس نقصان کی تلافی نہیں کرتا۔ لیکن تعجب خیز بات یہ ہے کہ اس یادداشت میں بھی مسلمانوں کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش نہیں کی گئی، جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے حکومت ہند نے بھی اسی "نہایت احتیاط سے تیار کی ہوئی متوازن اسکیم" کی حمایت کی ہے جس کو پنجاب کونسل کے سرکاری ممبروں نے مرتب کیا تھا اور جس کے ماتحت مسلمانان پنجاب کو پوری مجلس میں صرف ۴۹ فیصدی نشستیں ملتی ہیں اور ہندوؤں اور سکھ اراکین پر صرف دو کی اکثریت حاصل ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ پنجاب کی مثال بجائے خود اس قدر فیصلہ کن ہے کہ اس کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مسلمانان پنجاب کسی ایسی اسکیم کو تسلیم نہیں کر سکیں گے جس کی رو سے انہیں پوری مجلس میں قطعی اکثریت حاصل نہ ہو جائے۔ بہرحال لارڈ ارون اور ان کی حکومت کو اس امر سے اتفاق ہے کہ جب تک حق رائے دہندگی اس قدر وسیع نہ ہو جائے کہ ہر ملت کا تناسب آبادی واضح طور پر اس کے نمائندوں سے ظاہر ہو سکے اور جب تک تمام مسلمان باتفاق رائے جداگانہ نمائندگی کے حق سے دستبردار نہ ہو جائیں، ہندوستان کی اقلیتیں اس امر کی مجاز ہوں گی کہ فرقہ وارانہ انتخابات کو قائم رکھیں، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب حکومت ہند کے نزدیک مسلمانوں کی شکایت بجا ہے تو اسے اتنی جرات کیوں نہیں ہوئی کہ وہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کے لئے آئینی اکثریت کی سفارش کرتی۔

مسلمانان ہندوستان کو کسی ایسی تبدیلی سے بھی اتفاق نہیں ہو گا جس کے ماتحت سندھ کو ایک علیحدہ صوبہ نہ کر دیا جائے یا شمال مغربی سرحدی صوبے کا سیاسی درجہ وہی نہ ہو جائے جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کا ہے۔ سندھ اور بلوچستان کو باہم ملا کر ایک نیا صوبہ قائم کر دینا چاہئے۔ احاطہ بمبئی اور سندھ میں کوئی چیز بھی تو مشترک نہیں۔ ارکان کمیشن کو بھی اعتراف ہے کہ اہل سندھ کی زندگی اور ان کا تمدن عراق اور عرب سے مشابہ ہے نہ کہ ہندوستان سے۔ مشہور اسلامی جغرافیہ دان مسعودی نے آج سے بہت پہلے عرب اور سندھ کی اسی باہمی مشابہت کی طرف اشارا کر دیا تھا۔ مسعودی نے لکھا ہے کہ "سندھ وہ ملک ہے جو مملکت اسلامی سے قریب تر ہے۔" سب سے پہلے اموی خلیفہ کا قول تھا کہ مصر کی پشت افریقہ کی جانب ہے اور منہ مغرب کی۔ مناسب

ردوبدل کے ساتھ یہی کچھ سندھ کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے کہ سندھ کی پیٹھ ہندوستان کی طرف سے اور منہ وسط ایشیا کی جانب۔ علاوہ ازیں اگر سندھ کے ان زراعتی مسائل جن سے حکومت بمبئی کو مطلق ہمدردی نہیں اور اسکی بے شمار تجارتی صلاحیتوں کا لحاظ رکھ لیا جائے اس لئے کہ کراچی بڑھتے بڑھتے ایک روز لازماً ہندوستان کا دوسرا دارالسلطنت بن جائے گا' تو صاف نظر آ جاتا ہے کہ اس کو احاطہ بمبئی سے ملحق رکھنا مصلحت اندیشی سے کس قدر دور ہے۔ بے شک اس وقت بمبئی کا رویہ دوستانہ ہے لیکن ممکن ہے کہ وہ کل ہی اس کا حریف بن جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ اس راہ میں کچھ مالی مشکلات حائل ہیں۔ ابھی تک اس کے متعلق کوئی مستند بیان میری نظر سے نہیں گذرا لیکن فرض کر لیجئے کہ اس قسم کی مشکلات موجود ہیں اس کے یہ معنی تو نہیں کہ حکومت ہند اس امید افزا صوبے کو اپنی آزادانہ ترقی کی جدوجہد میں عارضی طور پر مدد نہ دے۔

رہا شمال مغربی سرحدی صوبہ۔ سو یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ ارکان کمیشن نے عملاً اس امر سے انکار کر دیا ہے کہ اس صوبے کے باشندوں کو بھی اصلاحات کا حق حاصل ہے۔ ان کی سفارشات برے (Bray) کمیٹی سے بھی کم ہیں اور وہ جس کونسل کی تجویز پیش کرتے ہیں وہ چیف کمشنر کی مطلق العنانی کے لئے محض ایک آڑ کا کام دے گی۔ افغانوں کا یہ پیدائشی حق کہ وہ سگرٹ روشن کر سکیں محض اس لئے سلب کر لیا گیا ہے کہ وہ ایک بارود خانے میں رہتے ہیں ارکان کمیشن کی یہ دلیل کس قدر بھی لطیف کیوں نہ ہو اس سے کسی جماعت کا اطمینان نہیں ہو سکتا۔ سیاسی اصلاحات کی مثال روشنی کی سی ہے نہ کہ آگ کی اور ہمارا فرض ہے کہ ہم تمام انسانوں کو یہ روشنی پہنچائیں خواہ وہ خانہ بارود میں رہتے ہوں یا کوئلے کی کان میں۔ افغان ایک بہادر اور ذہین قوم ہے۔ وہ اپنے مقاصد کے لئے ہر قسم کی تکلیف برداشت کر سکتے ہیں۔ وہ ہر ایسی کوشش کی شدت سے مزاحمت کریں گے جو ان کو آزادانہ ترقی کے حق سے روک دے۔ ان لوگوں کو مطمئن رکھنا ہندوستان اور انگلستان دونوں کے لئے مفید ہے۔ گذشتہ ایام میں اس بدقسمت صوبے میں جو المناک واقعات پیش آ چکے ہیں' وہ محض اس امتیازی اور غیر ہمدردانہ سلوک کا نتیجہ ہیں جو ہندوستان میں اصول حکومت خود اختیاری کے نفاذ سے لے کر روا رکھا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ برطانوی مدبرین صحیح حالات کا اندازہ کرنے میں غلطی نہیں کریں گے اور

وہ اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا نہیں رکھیں گے کہ اس صوبے میں جو کچھ پیش آ رہا ہے خارجی اثرات کا نتیجہ ہے۔

حکومت ہند نے بھی اپنی یادداشت میں صوبہ سرحدی کے لئے جن اصلاحات کی سفارش کی ہے وہ ناکافی ہے۔ بے شک ان کا دائرہ کمیشن کی سفارشات سے وسیع ہے کیونکہ اس میں ایک طرح کی منتخب کونسل اور نیم منتخب کابینہ کی تجویز کی گئی ہے لیکن حکومت ہند نے بھی اس صوبے کو وہ سیاسی درجہ نہیں دیا جو دوسرے صوبوں کو حاصل ہے۔ حالانکہ افغان جبلتاً اس بات کے کہیں زیادہ اہل ہیں کہ ہندوستان کے دوسرے باشندوں کی نسبت جمہوری ادارات میں حصہ لیں۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس

میرا خیال ہے کہ اب مجھے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے متعلق چند سرسری اشارات کر دینا چاہئے۔ ذاتی طور سے مجھے اس کانفرنس سے کوئی امید وابستہ نہیں البتہ یہ ضرور تصور کیا جاتا تھا کہ فرقہ وارانہ تنازعات کے رزمگاہ سے دور ایک بدلی ہوئی فضا میں لوگ کہیں زیادہ ہوشمندی سے کام لیں گے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ واقعات اس کے بالکل برعکس ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فرقہ وارانہ مسائل پر جو بحث لندن میں ہوئی ہے اس سے مسلمانوں اور ہندوؤں کا تمدنی اختلاف اور بھی زیادہ واضح ہو گیا ہے۔ بایں ہمہ وزیراعظم انگلستان کو اس امر سے انکار ہے کہ ہندوستان کا مسئلہ بین الاقوامی ہے قومی نہیں۔ انہوں نے کہا ہے: "یہ ایک دشوار بات ہو گی کہ میری حکومت پارلیمنٹ کے سامنے جداگانہ انتخابات کی تجاویز پیش کرے اس لئے کہ مخلوط انتخابات انگریزوں کے جذبات جمہوریت پسندی کے زیادہ قریں ہیں۔" انہوں نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ ایک ایسے ملک میں جہاں متعدد قومیں آباد ہوں برطانوی جمہوریت کی صورت قائم نہیں ہو سکتی۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ اس مسئلہ کو جغرافیائی اصول پر حل کیا جائے۔ جداگانہ انتخابات کو قائم رکھنا اس کا کوئی عمدہ بدل نہیں ہے۔ مجھے یہ بھی امید نہیں کہ اقلیتوں کی سب کمیٹی کسی صحیح نتیجے پر پہنچے۔ آخر الامر سارا مسئلہ برطانوی پارلیمنٹ میں پیش ہو گا۔ ہمیں امید ہے کہ انگریز قوم کے بالغ نظر نمائندے اس مسئلے کو محض سطحانہ نگاہوں سے نہیں دیکھیں گے، جیسا کہ اب تک ہندوستان کے اکثر ارباب سیاست نے کیا ہے بلکہ ان کی

نگاہیں اس معاملہ کی تہہ تک پہنچ جائیں گی اور وہ محسوس کر لیں گے کہ ہندوستان کے اندر امن و سکون کے قیام کا طریق کیا ہے۔ ہر وہ دستور جو اس تصور پر مبنی ہو گا کہ ہندوستان میں ایک ہی قوم بستی ہے یا جن کا مقصد یہ ہو کہ یہاں ان اصولوں کا نفاذ کیا جائے جو برطانیہ کے جذبات جمہوریت پسندی کا نتیجہ ہیں' اس کا مطلب صرف اسی قدر ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کو ناداستہ خانہ جنگی کے لئے تیار کیا جائے۔ جہاں تک میری سمجھ کام کرتی ہے اس ملک میں اس وقت امن و سکون قائم نہیں ہو سکتا جب تک اس امر کو تسلیم نہ کر لیا جائے کہ ہندوستان کی ہر ملت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کئے بغیر جدید صوبوں پر آزادی کے ساتھ ترقی کرے۔

مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ ہمارے مسلمان مندوبین کو اس مسئلے کے صحیح حل کی اہمیت کا پورا پورا احساس ہے جس کو ہم نے ہندوستان کا بین الاقوامی مسئلہ کہا ہے۔ ان کا یہ اصرار بالکل بجا ہے کہ مرکزی حکومت میں ذمہ داری کا مسئلہ طے کرنے سے پہلے فرقہ وارانہ تنازعات کا تصفیہ ہو جانا ضروری ہے۔ کسی مسلمان سیاسی رہنما کو اس طعن آمیز لفظ (یعنی لفظ فرقہ واری) کا مطلق خیال نہیں کرنا چاہئے جسے ہندو محض پراپیگنڈا کی خاطر استعمال کر رہے ہیں تاکہ بقول وزیر اعظم وہ انگلستان کی جذبات پسندی سے فائدہ اٹھا سکیں اور انگریز غلطی سے یہ فرض کر لیں کہ ہندوستان کی واقعی وہ حالت ہے جو اصل میں ہے نہیں۔ اس وقت بڑے بڑے مقاصد خطرے میں ہیں۔ ہماری تعداد سات کروڑ ہے اور ہم ہندوستان کے دوسرے باشندوں کی نسبت کہیں زیادہ یکرنگ قوم ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ہندوستان میں کوئی قوم بستی ہے تو وہ مسلمان ہی ہیں۔ اگرچہ ہندو ہر بات میں ہم سے آگے ہیں لیکن ابھی تک ان کو وہ یک رنگی حاصل نہیں ہوئی جو ایک قوم بننے کے لئے ناگزیر ہے اور جو اسلام نے از خود آپ کو عطا کی ہے۔ بے شک ہندو اس امر کے لئے مضطرب ہیں کہ وہ ایک قوم بن جائیں مگر قوموں کی ترکیب گویا ایک نئی زندگی میں قدم رکھنا ہے اور جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے کہ وہ اپنے تمام نظام معاشرت کو یک قلم بدل دیں۔ ایسے ہی مسلمان رہنماؤں اور ارباب سیاست کو اس لطیف مگر مغالطہ انگیز دلیل سے بھی متاثر ہونا نہیں چاہئے کہ ترکی' ایران اور دوسرے اسلامی ممالک قوم پسندی کے اصولوں پر گامزن ہیں۔ مسلمانان ہندوستان کی حالت ان

سے بالکل مختلف ہے۔ ان ممالک کی ساری آبادی تقریباً مسلمانوں کی ہے اور جو اقلیتیں باقی رہ جاتی ہیں ان کا تعلق بہ اصطلاح قرآنی اہل کتاب سے ہے۔ مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان کوئی معاشرتی دیوار حائل نہیں۔ اگر کوئی یہودی' عیسائی یا زرتشتی (یعنی پارسی) کسی مسلمان کا کھانا چھو لے تو وہ نجس نہیں ہو جاتا۔ شریعت اسلامی کی رو سے ان میں باہم مناکحت جائز ہے۔ حقیقت میں یہ وہ اولین قدم تھا جو اسلام نے عملاً اتحاد بنی نوع انسانی کی خاطر اٹھایا۔ اس نے ان لوگوں کو جن کا اخلاقی نصب العین تقریباً ایک ساتھ باہم مل جانے کی دعوت دی۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے :

"یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ (یعنی توحید) سواء بیننا و بینکم

یہ الگ بات ہے کہ مسلمان اور عیسائی اقوام کے باہمی جنگ و جدل اور پھر مغرب کی چیرہ دستیوں نے اس امر کا موقعہ نہیں دیا کہ دنیائے اسلامی اس آیت کے لاانتہا معنوں کو عمل میں لاتی۔ بہرحال آج بلاد اسلامیہ میں یہ مقصد اسلامی قومیت کی شکل میں پورا ہو رہا ہے۔

مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہم اپنے مندوبین کی کامیابی کا اندازہ صرف اس ایک امر سے کر سکتے ہیں کہ وہ کانفرنس کے غیر مسلم مندوبین سے قرار داد دہلی کے مطالبات کہاں تک منوا لیتے ہیں۔ اگر ان مطالبات کو مسترد کر دیا گیا تو ایک نہایت ہی اہم اور عظیم الشان سوال پیدا ہو گا۔ اس وقت ضرورت ہو گی کہ ہندوستان کے مسلمان ایک ہو کر آزادانہ سیاسی قدم اٹھائیں۔ اگر آپ اپنے مقاصد اور اپنے نصب العین پر واقعی سنجیدگی سے قائم ہیں تو آپ کو اس قسم کے عمل کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ ہمارے سر برآوردہ لوگوں نے کافی غور و خوض سے کام لیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک حد تک یہ انہی کے غور و فکر کا نتیجہ ہے کہ ہم لوگ ان قوتوں سے آشنا ہوئے ہیں جو ہندوستان کے اندر اور اس کے باہر ہماری آئندہ سمتوں کی تشکیل میں کار فرما ہیں' لیکن میں آپ سے اس قدر پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اس غور و فکر نے ہم میں اتنی قابلیت پیدا کر دی ہے کہ اگر مستقبل قریب میں ضرورت پیش آئے تو ہم اپنے آپ کو اسی قسم کے عمل کے لیئے تیار پائیں' جو حالات کے مقتضی ہو؟ مجھے آپ سے بلاتکلف کہہ دینا چاہئے کہ ہندوستان کے مسلمان اس وقت دو عوارض کا شکار ہو رہے ہیں۔ پہلا عارضہ یہ ہے کہ ہم

میں شخصیتوں کا وجود نہیں۔ سر ما لکم ہیلی اور لارڈ ارون کی تشخیص بالکل صحیح تھی جب انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ملت اسلامیہ نے کوئی رہنما پیدا نہیں کیا۔ رہنماؤں سے میرا مطلب وہ افراد ہیں جن کو عنایت ایزدی یا وسیع تجربات کی بدولت ایک طرف یہ ادراک حاصل ہو کہ اسلامی تعلیمات کی روح اور اس کی تقدیر کیا ہے' دوسری طرف ان میں یہ صلاحیت موجود ہو کہ وہ جدید حوادث کی رفتار کا اندازہ صحت کے ساتھ کر سکیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر کسی قوم کی قوت عمل کا انحصار ہوتا ہے۔ دوسرا مرض جو مسلمانوں کے اندر گھر کر چکا ہے یہ ہے کہ ان میں اطاعت کا مادہ باقی نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آج متعدد افراد اور متعدد جماعتیں الگ الگ راہوں پر گامزن ہیں اور اس سے قوم کے عام افکار اور اس کی سرگرمیوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جو طرز عمل ہم نے مذہب میں اختیار کر رکھا تھا اب وہی سیاسیات میں ہو گیا ہے' لیکن مذہبی فرقہ بندیوں سے اتنا نقصان نہیں پہنچتا اس لئے کہ ان سے کم از کم اتنا تو ظاہر ہوتا ہے کہ ہمیں اس اصول سے دلچسپی ہے جس پر ہماری ترکیب کا انحصار ہے۔ مزید برآں یہ اصول اس قدر وسیع ہے کہ کسی فرقے کو اس قدر جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ اسلام کی حدود ہی سے باہر نکل جائے۔ برعکس اس کے اگر سیاسی زندگی میں اختلافات کو جائز رکھا گیا' بالخصوص اس وقت جب مفاد ملت کی خاطر اتحاد عمل کی ضرورت ہے' تو اس کا نتیجہ سوائے ہلاکت کے اور کچھ نہیں ہو گا' لہٰذا سوال یہ ہے کہ ان دونوں امراض کے علاج کی صورت کیا ہے۔ اول الذکر کا تدارک ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے البتہ جہاں تک دوسری بیماری کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ ہم اس کا دفیعہ کر سکتے ہیں۔ میں نے س موضوع پر ایک خاص رائے قائم کر رکھی ہے لیکن بہتر ہو گا کہ میں اس وقت تک اس کا اظہار نہ کروں جب تک کہ ایسی صورت حال پیدا نہ ہو جائے جس کا خطرہ ہے۔ خدانخواستہ اگر ایسا ہوا تو تمام سربرآوردہ مسلمانوں کا' خواہ ان کے خیالات کچھ بھی ہوں فرض ہو گا کہ وہ ایک جگہ جمع ہوں اور صرف قراردادیں ہی منظور نہیں کریں بلکہ اپنے مقاصد میں حقیقی کامیابی کے حصول کے لئے مسلمانوں کے سامنے کوئی راہ عمل پیش کریں۔ میں نے اس امر کا تذکرہ صرف اس لئے کر دیا ہے کہ آپ نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کریں۔

خاتمہ سخن

حضرات مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا کر چکا۔ آخر میں اتنا عرض کروں گا کہ مسلمانان ہند اس وقت اپنی زندگی کے جس نازک دور میں سے گذر رہے ہیں اس کے لئے کامل تنظیم اور اتحاد عزائم و مقاصد کی ضرورت ہے۔ ہمارے ملّی وجود کی بقا اور ہندوستان کا مفاد صرف اسی ایک امر سے وابستہ ہے۔ ہندوستان کی سیاسی غلامی تمام ایشیا کے لئے لامتناہی مصائب کا سرچشمہ ہے۔ اس نے مشرق کی روح کو کچل ڈالا ہے اور اسے اظہار ذات کی اس مسرت سے محروم کر دیا ہے جس کی بدولت کبھی اس میں ایک بلند اور شاندار تمدن پیدا ہوا تھا۔ ہم پر ایک فرض ہندوستان کی طرف سے عائد ہوتا ہے جو ہمارا وطن ہے اور جس میں ہمیں جینا اور مرنا ہے اور ایک فرض ایشیا بالخصوص اسلامی ایشیا کی جانب سے اور چونکہ ایشیا کے دوسرے اسلامی ممالک کی نسبت ایک ہی ملک میں سات کروڑ مسلمانوں کی موجودگی اسلام کے لئے ایک بیش بہا سرمایہ ہے لہٰذا ہمیں چاہئے کہ ہم ہندوستان کے مسئلے پر محض اسلامی زاویہ نگہ ہی سے نہیں بلکہ ہندی مسلمانوں کے نقطہ نظر سے غور کریں۔ ایشیا اور ہندوستان کی طرف سے ہم پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں ان کی بجا آوری اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم اپنے ارادوں کو ایک مخصوص مقصد پر جمع نہیں کرلیں گے۔ اگر آپ ہندوستان کی دوسری ملتوں کے درمیان اپنا وجود قائم رکھنا چاہتے ہیں تو آپ کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں۔ ہماری بے نظم اور منتشر حالت کے باعث بہت سے ایسے سیاسی مصالح جو ہماری زندگی کے لئے ناگزیر ہیں، دن بدن پیچیدہ ہو رہے ہیں۔ میں فرقہ وارانہ مسائل کے تصفیہ سے مایوس نہیں ہوں لیکن میں آپ سے اپنے اس احساس کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتا کہ موجودہ نازک حالات کے تدارک کے لئے ہماری ملت کو مستقبل قریب ہی میں آزادانہ جدوجہد کرنا پڑے گی۔ لیکن کسی سیاسی طرز عمل کے لئے آزادانہ جدوجہد کرنا اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب پوری قوم اس پر آمادہ ہو اور ان کے تمام عزائم اور ارادے ایک ہی مقصد پر مرتکز ہو جائیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم لوگوں کے اندر بھی وہ اشتراک عزم پیدا ہو جائے جس کا ازخود نشوونما ہوتا ہے؟ کیوں نہیں۔ فرقہ بندی کی ہوس اور نفسانیت کی قیود سے آزاد ہو جانے اور پھر اس نصب العین کی روشنی میں جو آپ کی طرف منسوب ہے اپنے انفرادی

اور اجتماعی اعمال کی قدروقیمت کا اندازہ کیجئے خواہ وہ مادی اغراض ہی سے متعلق کیوں نہ ہوں۔ مادیات سے گذر کر روحانیات میں قدم رکھیئے۔ مادہ کثرت ہے لیکن روح نور ہے' حیات ہے' وحدت ہے۔ ایک سبق جو میں نے تاریخ اسلام سے سیکھا ہے یہ ہے کہ یہ صرف اسلام تھا جس نے آڑے وقتوں میں مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا نہ کہ مسلمان۔ اگر آج آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جمادیں اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سر نو جمع ہو جائیں گی اور آپ کا وجود ہلاکت و بربادی سے محفوظ ہو جائے گا۔ قرآن مجید کی ایک نہایت معنی خیز آیت یہ ہے کہ ہمارے نزدیک ایک پوری ملت کی موت و حیات کا سوال ایسا ہی ہے جیسے ایک نفس واحد کا۔ پھر کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم مسلمان جو بجا طور پر یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہ ہمیں تھے جو سب سے پہلے انسانیت کے اس بلند اور ارفع تصور پر عمل پیرا ہوئے ایک نفس واحد کی طرح زندہ ہیں۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ ہندوستان کی حالت وہ نہیں جیسی کہ نظر آتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں کسی شخص کو حیرت میں ڈالنا چاہتا ہوں۔ بہرحال اس کے صحیح معنے آپ پر اسی وقت آشکارا ہو سکیں گے جب آپ ان کے مشاہدے کے لئے ایک صحیح اجتماعی انا پیدا کر لیں گے۔

علیکم انفسکم لا یضر کم من ضل اذا اهتدیتم (۵ : ۱۰۴)

ترجمہ : سید نذیر نیازی' رسالہ صوفی جلد ۴۵' شمارہ ۴' اپریل ۱۹۳۱ء

ضمیمہ ب
اقبال کے خطوط بنام قائداعظم

لاہور ۲۳ مئی ۱۹۳۶ء

ڈیر مسٹر جناح

ابھی ابھی آپ کا خط ملا اس کے لئے بے حد ممنوں ہوں۔ مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ کا کام پارلیمانی بورڈ کے سلسلے میں آگے بڑھ رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ پنجاب کی جماعتیں بالخصوص احرار اور اتحاد ملت کچھ پس و پیش کے بعد بالآخر آپ کے ساتھ شامل ہو جائیں گی۔ اتحاد ملت کے ایک سرگرم و فعال رکن نے مجھے چند روز ہوئے یہی بات بتلائی ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کے رویے کے بارے میں خود اتحاد ملت کے لوگ بھی کچھ زیادہ وثوق سے نہیں کہہ سکتے۔ بہر حال ابھی کافی وقت ہے اس لئے جلد ہی معلوم ہو جائے گا کہ رائے دہندگان اسمبلی میں اتحاد ملت کے آدمی بھیجنے کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔

امید ہے کہ آپ کے مزاج بخیر ہوں گے۔ ملاقات کا آرزومند

آپ کا مخلص

محمد اقبال

لاہور، ۹ جون ۱۹۳۶ء

مائی ڈیر مسٹر جناح

میں آپ کو اپنا مسودہ بھیج رہا ہوں اور اس کے ساتھ ہی کل کے "ایسٹرن ٹائمز" کا ایک تراشہ بھیج رہا ہوں۔ یہ گورداسپور کے ایک قابل وکیل کا ایک خط ہے۔

مجھے امید ہے کہ پارلیمانی بورڈ کی جانب سے جو بیان جاری کیا جائے گا اس میں سکیم کی پوری تفصیل موجود ہو گی اور ساتھ ہی اس سکیم پر اب تک جو اعتراضات کئے گئے ہیں ان کا جواب بھی دیا جائے گا۔ اس بیان میں راست بازی سے مسلمانان ہند کی حکومت اور ہندوؤں کے ضمن میں موجودہ پوزیشن سے متعلق واضح اور صاف صاف اعلان ہونا چاہئے۔ اس بیان میں یہ انتباہ بھی ہونا چاہئے کہ اگر مسلمانان ہند نے موجودہ پارلیمانی بورڈ سکیم کو منظور نہیں کیا تو نہ صرف وہ تمام کچھ جو انہوں نے گزشتہ پندرہ

سالوں میں حاصل کیا کھو دیں گے بلکہ اپنا شیرازہ خود اپنے ہاتھوں سے درہم برہم کر کے اپنے لئے خسارے کا باعث ہوں گے۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

مکرر : میں آپ کا ممنون ہوں گا اگر آپ اپنا بیان اخبارات کو بھیجنے سے قبل مجھے بھیج سکیں۔

بیان میں ایک اور نکتہ جو واضح کیا جائے پیش کرتا ہوں۔

(1) مرکزی اسمبلی کے لئے بالواسطہ طریق انتخاب نے یہ بات قطعی طور پر ضروری بنا دی ہے کہ جو اراکین صوبائی اسمبلیوں کے لئے منتخب کئے جائیں وہ آل انڈیا مسلم پالیسی اور پروگرام کے پابند ہوں تاکہ وہ مرکزی اسمبلی کے لئے جو نمائندے چنیں وہ ایسے لوگ ہوں جو سنٹرل اسمبلی میں مرکزی امور جن کا تعلق خاص مسلمانوں سے ہے ان کی تائید و حمایت کریں اور اپنی حیثیت اس طرح منوائیں کہ جس سے معلوم ہو کہ وہ ہندوستان کی دوسری بڑی قوم ہیں۔ جو لوگ اس وقت صوبائی پالیسیوں اور پروگراموں کی حمایت کر رہے ہیں دراصل وہی لوگ مرکزی اسمبلی کے لئے بالواسطہ طریق انتخاب کو آئین کا جزو بنانے کے سلسلے میں آلہ کار بنے ہوئے تھے۔ بلاشبہ اسی امر میں غیر ملکی حکومت کا مفاد وابستہ تھا۔ اب جب کہ ہماری قوم اس بدبختی (بالواسطہ انتخاب) سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتی ہے اور اس نے انتخاب کے لئے ایک کل ہند پالیسی طے کی ہے جس کی ہر صوبائی امیدوار پابندی کرے تو اب وہی لوگ غیر ملکی حکومت کے اشاروں پر قوم کو شیرازہ بندی کی کوشش میں ناکام بنانے کے لئے مصروف عمل ہیں۔

(2) اسلامی وقف (جیسا کہ مسجد شہید گنج نے ضرورت کا احساس کرایا ہے) سے متعلق قانون اور اسلامی ثقافت' زبان' مساجد اور قانون شریعت سے متعلق مسائل پر بھی توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

پرائیویٹ اور خفیہ

لاہور ۲۵ جون ۱۹۳۶ء

مائی ڈیر مسٹر جناح

دو ایک روز قبل سر سکندر حیات لاہور سے روانہ ہو گئے۔ میرا خیال ہے کہ وہ آپ سے بمبئی میں ملیں گے اور آپ سے چند اہم امور پر بات چیت کریں گے۔ کل شام دولتانہ مجھ سے ملنے آئے تھے وہ کہتے تھے کہ یونینسٹ پارٹی کے مسلمان اراکین مندرجہ ذیل اعلان کرنے کو تیار ہیں کہ :

"ان تمام امور میں جن کا تعلق مسلم قوم سے بحیثیت ایک کل ہند اقلیت کے ہو گا وہ لیگ کے فیصلہ کے پابند ہوں گے اور صوبائی اسمبلی میں کسی بھی غیر مسلم گروپ کے ساتھ قطعاً کوئی معاہدہ نہیں کریں گے"۔ بشرطیکہ صوبائی لیگ مندرجہ ذیل اعلان کرے کہ :

"جو لوگ لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوں گے وہ اس پارٹی یا گروپ کے ساتھ تعاون کریں گے جس میں مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہو گی۔"

از رہِ کرام اپنی پہلی فرصت میں اس تجویز کے بارے میں اپنی رائے سے مطلع فرمائیں نیز سر سکندر سے آپ کی جو گفتگو ہوئی اس کے نتائج سے بھی آگاہ فرمائیں۔ اگر آپ انہیں قائل کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو شاید وہ ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔ امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

میو روڈ لاہور، ۲۳ اگست ۱۹۳۶ء

مائی ڈیر مسٹر جناح

مجھے امید ہے کہ آپ کو میرا خط مل گیا ہو گا۔ پنجاب پارلیمانی بورڈ اور یونینسٹ پارٹی کے درمیان کسی مفاہمت کی خبریں سننے میں آ رہی ہیں۔ میں اس قسم کی مفاہمت کے بارے میں آپ کی رائے جاننا پسند کروں گا نیز یہ کہ اس قسم کی مفاہمت کی کیا شرائط ہونی چاہئیں۔ میں نے اخبارات میں پڑھا کہ آپ نے بنگال پرجا پارٹی اور مسلم لیگ مرکزی پارلیمانی بورڈ کے درمیان مفاہمت کرائی ہے۔ میں اس مفاہمت کی شرائط و ضوابط جاننا پسند کروں گا۔ چونکہ پرجا پارٹی بھی یونینسٹ پارٹی کی مانند ایک غیر فرقہ وار جماعت ہے۔ بنگال میں آپ کی مفاہمت یہاں بھی آپ کے لئے فائدہ مند ہو سکتی ہے۔

امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

"نہایت خفیہ"

لاہور، ۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء

مائی ڈیر مسٹر جناح

مجھے امید ہے کہ آپ نے پنڈت نہرو کا وہ خط پڑھا ہو گا جو انہوں نے آل انڈیا نیشنل کنونشن کے موقع پر پڑھا اور اس خطبے میں ہندوستانی مسلمانوں سے متعلق جو روح کارفرما نظر آتی ہے وہ بھی آپ کی نظروں سے پوشیدہ نہ ہو گی۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ نئے آئین ۱۹۳۵ء نے ہندوستانی مسلمانوں کو ہندوستان اور مسلم ایشیا میں آئندہ سیاسی تبدیلیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے آپ کو منظم کرنے کا ایک نادر موقع فراہم کیا ہے۔ اگرچہ ہم ملک کی دیگر ترقی پسند جماعتوں کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہیں لیکن ہمیں اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کرنا چاہئے کہ ایشیا میں اسلام کی سیاسی اور اخلاقی قوت کا انحصار کلیۃً مسلمانان ہند کی تنظیم کامل پر منحصر ہے۔ اس لئے میری تجویز یہ ہے کہ آل انڈیا نیشنل کنونشن کو ایک پرزور جواب دیا جائے۔ آپ دہلی میں فوراً آل انڈیا مسلم کنونشن کا انعقاد کریں جس میں تمام صوبائی اسمبلیوں کے نو منتخب ارکان اور دیگر اہم مسلمان سیاسی لیڈروں کو مدعو کریں۔ اس کنونشن میں آپ پوری قوت اور واشگاف طور پر ہندوستانی مسلمانوں کا سیاسی نصب العین واضح کر دیں گے کہ وہ ملک میں ایک جداگانہ سیاسی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندوستان اور بیرون ہند یہ بتلانا بھی نہایت ضروری ہے کہ ہندوستان کو محض اقتصادی مسئلہ ہی درپیش نہیں ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اسلامی نقطۂ نظر سے تہذیبی ورثے کا مسئلہ بھی بہت اہم ہے بلکہ یہ اقتصادی مسئلے سے کم اہم نہیں۔ اگر آپ اس نوع کا کنونشن منعقد کریں تو پھر ایسے مسلم اراکین اسمبلی کی نیتوں کا پتہ بھی چل جائے گا جنہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی خواہشات اور مقاصد کے خلاف جماعتیں بنا رکھی ہیں۔ علاوہ ازیں اس سے ہندوؤں پر بھی یہ واضح ہو جائے گا کہ خواہ کیسی ہی عیارانہ سیاسی چال کیوں نہ چلی جائے ہندوستانی مسلمان اپنی ثقافتی وحدت

سے آنکھیں بند نہیں سکتے۔ میں چند ایک روز میں دہلی آ رہا ہوں اور اس اہم معاملے پر آپ سے گفتگو کروں گا۔ میں افغان قونصل خانے میں قیام کروں گا' اگر آپ کچھ وقت نکال سکیں تو ہماری وہاں ملاقات ہو جائے۔

ازراہ کرم اس خط کے جواب میں چند حروف جلد از جلد تحریر فرما دیں۔

مکرر : معاف فرمایئے یہ خط میں نے اپنے ایک دوست سے لکھوایا ہے کیونکہ میری بینائی خراب ہوتی جا رہی ہے۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

لاہور' ۲۲ اپریل ۱۹۳۷ء

مائی ڈیر مسٹر جناح

کوئی دو ہفتے ہوئے آپ کو ایک خط تحریر کیا تھا معلوم نہیں وہ خط آپ تک پہنچا ہے یا نہیں۔ یہ خط آپ کے دہلی کے پتہ پر لکھا تھا۔ بعد میں جب دہلی گیا تو معلوم ہوا کہ آپ دہلی سے پہلے ہی روانہ ہو چکے ہیں۔ میں نے اپنے اس خط میں تجویز کیا تھا کہ ہمیں فوراً آل انڈیا مسلم کنونشن دہلی میں منعقد کرنی چاہئے اور ایک مرتبہ پھر حکومت اور ہندوؤں سے متعلق مسلمانان ہند کی پالیسی کی وضاحت کرنی چاہئے۔

چونکہ صورت حال نازک ہوتی جا رہی ہے اور پنجاب میں مختلف وجوہ کی بنا پر جس کی تفصیل اس وقت غیر ضروری ہے مسلمانوں کے رجحانات تیزی سے کانگرس کی طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں اس لئے میں درخواست کروں گا کہ آپ اس معاملے پر غور فرمائیں اور اس کے متعلق جلد از جلد فیصلہ کریں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس اگست تک ملتوی ہو چکا ہے اس لئے ان حالات میں ضروری ہے کہ مسلمانوں کی پالیسی سے متعلق دوبارہ فوری اعلان کیا جائے۔ اگر مجوزہ کنونشن سے قبل ممتاز مسلمان قائدین ملک کا دورہ کریں تو کنونشن کی کامیابی یقینی ہے۔ ازراہ کرم اس خط کا جواب جس قدر جلد ممکن ہو عنایت فرمائیں۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

لاہور ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء

مائی ڈیر مسٹر جناح

آپ کے خط کا شکریہ جو مجھے اس اثنا میں مل گیا۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ لیگ کے پروگرام اور آئین میں تبدیلی سے متعلق جو کچھ میں نے آپ کو لکھا تھا آپ اسے مدنظر رکھیں گے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ آپ کو اس صورت حال کی نزاکت جس کا مسلم ہند سے تعلق ہے پورا پورا احساس ہے۔ لیگ کو بالآخر یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ وہ مسلمانوں کے محض اعلیٰ طبقے کی نمائندہ بنی رہے یا عام مسلمانوں کی نمائندگی کرے جو اب تک معقول وجوہ کی بناء پر اس میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ کوئی سیاسی جماعت جب تک عام مسلمانوں کی حالت کو بہتر بنانے کا وعدہ نہ کرے وہ اس وقت تک عوام کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی۔

نئے آئین ۱۹۳۵ء میں بڑی بڑی اسامیاں تو اعلیٰ طبقے کے بچوں ہی کے لئے وقف ہیں اور جو چھوٹی ملازمتیں ہیں وہ وزراء کے دوستوں اور رشتہ داروں کی نذر ہو جاتی ہیں۔ دوسرے امور میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے عام مسلمان کی حالت کو بہتر بنانے کے باب میں سوچا ہی نہیں۔ روٹی کا مسئلہ دن بدن ٹیڑھا ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمانوں میں یہ احساس بڑھتا جا رہا ہے کہ گزشتہ دو سو سالوں میں وہ برابر تنزل کی طرف جا رہے ہیں۔ عام طور سے وہ مسلمان سمجھتے ہیں کہ ہندو کی سود خوری اور سرمایہ داری ان کی غربت کے ذمہ دار ہیں۔ لیکن یہ احساس کہ غیر ملکی حکومت بھی ان کے افلاس کی ذمہ دار ہے ابھی عام مسلمان کے ذہن میں پیدا نہیں ہوا۔ مگر یہ احساس ضرور پیدا ہو کر رہے گا۔ جواہر لعل کی لادینی اشتراکیت مسلمانوں میں کبھی مقبول نہیں ہو گی' لہٰذا سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی غربت کے مسئلہ کو کس طرح حل کیا جائے اور لیگ کا تمام مستقبل اس بات پر منحصر ہے کہ وہ کس حد تک مسلمانوں کے اس مسئلہ کا حل نکالتی ہے۔ اگر لیگ نے اس سلسلے میں کوئی امید افزا قدم نہ اٹھایا تو مجھے یقین ہے کہ مسلمان عوام پہلے کی مانند لیگ سے لاتعلق رہیں گے۔ خوش قسمتی سے اسلامی قانون کے نفاذ سے اس مسئلے کا حل ہو سکتا ہے۔

اسلامی قوانین کے گہرے اور دقت نظر مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا

ہوں کہ اگر اس قانون کو اچھی طرح سمجھا جائے اور اس پر عمل کیا جائے تو کم از کم ہر شخص کے لئے حق روزی تو محفوظ ہو جاتا ہے لیکن اس ملک میں جب تک ایک آزاد مسلم ریاست یا ریاستیں معرض وجود میں نہ آئیں اسلامی شریعت کا نفاذ ممکن نہیں۔ سال ہا سال سے میرا یہی عقیدہ رہا ہے اور میں اب بھی اسی کو مسلمانوں کی روٹی کے مسئلے اور ہندوستان کے امن و امان کا بہترین حل سمجھتا ہوں۔ اگر یہ بات ممکن نہیں تو ہندوستان کے لئے دوسرا راستہ محض خانہ جنگی کا باقی رہ جاتا ہے جو کہ درحقیقت پہلے ہی ہندو مسلم فسادات کی شکل میں کئی سالوں سے ظہور پذیر ہو چکی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ ہندوستان کے کچھ حصوں مثلاً شمال مغربی ہندوستان میں فلسطین کی داستان دھرائی جائے گی اور یہ بھی کہ جواہر لعل کی اشتراکیت اگر ہندوؤں کی ہیئت سیاسیہ میں سرایت کر گئی تو خود ہندوؤں میں بہت خون خرابہ ہو گا۔ معاشری جمہوریت (سوشل ڈیما کریسی) اور برہمنیت میں وجہ نزاع بدھ مت اور برہمنیت کے نزاع سے مختلف نہیں۔ آیا ہندوستان میں اشتراکیت کا حشر بدھ مت کا سا ہو گا یا نہیں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے اتنا ضرور نظر آتا ہے کہ اگر ہندو مت نے معاشرتی جمہوریت (سوشل ڈیما کریسی) کو قبول کر لیا تو خود ہندو دھرم ہی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اسلام کے لئے سوشل ڈیما کریسی (Social Democracy) کا کسی موزوں شکل میں اور شریعت کے مطابق قبول کرنا کوئی نئی بات یا انقلاب نہیں بلکہ ایسا کرنا اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف لوٹنا ہو گا۔ مسائل حاضرہ کا حل مسلمانوں کے لئے ہندوؤں سے کہیں زیادہ آسان ہے، لیکن جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں کہ مسلم ہند کے ان مسائل کا حل اسی وقت ممکن ہو سکے گا جب کہ ملک کی از سر نو تقسیم کی جائے اور ایک یا زائد مسلم ریاستیں جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہو وجود میں لائی جائیں۔ کیا آپ کے خیال میں اس مطالبے کا وقت نہیں آن پہنچا؟ شاید جواہر لال کی بے دین اشتراکیت کا آپ کے پاس یہ بہترین جواب ہے۔

بہرحال میں نے اپنے خیالات آپ کی خدمت میں اس امید پر پیش کر دیئے ہیں کہ آپ ان خیالات کو اپنے خطبہ یا لیگ کے آئندہ اجلاس کے مباحث میں پوری توجہ دیں گے۔ مسلم ہند کو یہ توقع ہے کہ آپ کی فطانت و فراست اس نازک مرحلے پر موجودہ مشکلات کا کوئی حل نکال لے گی۔

مخلص

محمد اقبال

مکرر : اس خط کے موضوع پر میرا ارادہ تھا کہ آپ کے نام اخبارات میں یک کھلا خط شائع کرا دوں لیکن مزید غور و خوض کے بعد میں نے موجودہ وقت کو اس کے لئے مناسب نہ پایا۔

لاہور، ۲۱ جون ۱۹۳۷ء

مائی ڈیر مسٹر جناح

مجھے کل آپ کا خط ملا شکریہ۔ مجھے علم ہے کہ آپ بہت مصروف انسان ہیں مگر امید ہے کہ اگر آپ کو بار بار خط لکھوں تو بارِ خاطر نہ ہو گا کیونکہ اس وقت جب کہ شمال مغربی ہندوستان بلکہ تمام ہندوستان میں جو طوفان بڑھتا آ رہا ہے ہندوستانی مسلمان صرف آپ ہی سے رہنمائی کی امید رکھتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت ہم حقیقتاً خانہ جنگی کی حالت میں ہیں اور اگر فوج اور پولیس موجود نہ ہو تو یہ چشم زدن میں عالمگیر ہو جائے۔ گزشتہ چند مہینوں سے ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات کا سلسلہ جاری ہے۔ صرف شمال مغربی ہندوستان میں ان تین ماہ میں کم از کم تین فسادات ہوئے اور ہندوؤں اور سکھوں کی جانب سے اہانت رسول کی کم از کم چار وارداتیں ہو چکی ہیں۔ ان چاروں وارداتوں کے مجرموں کو قتل کر دیا گیا۔ ادھر ہندوستان میں قرآن مجید کو جلانے کے واقعات بھی پیش آئے ہیں۔ اس تمام صورت حال کا میں نے بغور مطالعہ کیا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان تمام واقعات کی اصل وجہ نہ معاشی ہیں نہ مذہبی بلکہ سراسر سیاسی ہیں۔ وہ یہ کہ ہندو اور سکھ مسلمانوں کو ان کے اکثریتی صوبوں میں بھی ہراساں کرنا چاہتے ہیں۔ ادھر نیا آئین اس قسم کا ہے کہ اس نے مسلمانوں کو ان کے اکثریتی صوبوں میں بھی غیر مسلموں کا محتاج بنا رکھا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلم وزارت نہ یہ کہ کوئی مناسب کاروائی نہیں کر سکتی بلکہ الٹا مسلمانوں ہی سے ناانصافی برتی ہے تاکہ وہ لوگ جن کی امداد پر ان کی وزارت کا انحصار ہے ان کو خوش کر سکیں۔ دوسرے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وزارت بالکل غیر جانب دار ہے لہذا ہمارے پاس اس آئین ۱۹۳۵ء کو مسترد کرنے کے لئے خاص وجوہ موجود ہیں۔ مجھے تو یوں نظر آتا ہے کہ یہ آئین محض ہندوؤں کو خوش

کرنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ ہندو اکثریتی صوبوں میں ہندوؤں کو قطعی اکثریت حاصل ہے اور وہاں وہ مسلمانوں کو بالکل نظرانداز کر سکتے ہیں مگر مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی مسلمانوں کو ہندوؤں کا دست نگر بنا دیا گیا ہے۔ مجھے اس امر میں قطعاً کوئی شک و شبہ نہیں کہ نیا آئین مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے کی غرض سے بنایا گیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ مسلمانوں کی معاشی تنگ دستی کا بھی حل نہیں ہے جو مسلمانوں میں شدید تر ہوتی جا رہی ہے۔

کمیونل ایوارڈ ہندوستان میں مسلمانوں کے محض سیاسی وجود کو تسلیم کرتا ہے لیکن یہ اعتراف جو ان کی معاشی پسماندگی کا کوئی حل پیش نہیں کرتا ان کے لئے بے سود ہے۔ کانگرس کے صدر پنڈت جواہر لال نے تو غیر مبہم الفاظ میں مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی حیثیت ہی سے انکار کر دیا ہے۔ دوسری ہندو سیاسی جماعت ہندو مہاسبھا ہے جس کو ہندوؤں کی اصل نمائندہ جماعت سمجھتا ہوں کئی مرتبہ اعلان کیا ہے کہ ہندوستان میں ایک ہندو مسلم متحدہ قوم کا معرض وجود میں آنا ناممکن ہے۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ ہندوستان میں امن قائم رکھنے کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ اس کو نسلی، مذہبی اور لسانی اشتراک کی بناء پر از سرنو تقسیم کر دیا جائے۔ بہت سے برطانوی مدبرین بھی کچھ ایسا ہی سوچتے ہیں اور اس آئین کے جلو میں جو ہندو مسلم فسادات تیزی سے رونما ہو رہے ہیں وہ اس ملک میں اصل حقیقت حال کے متعلق ان کی مزید آنکھیں کھولیں گے۔ مجھے یاد ہے کہ میری انگلستان سے روانگی سے قبل لارڈ لوتھیاں نے بھی یہی کہا تھا کہ ہندوستان کے مصائب کا حل میری سکیم میں مضمر ہے مگر اس کو عملی جامہ پہنانے میں ۲۵ سال لگ سکتے ہیں۔ پنجاب کے بعض مسلمان یہ تجویز بھی پیش کر رہے ہیں کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کی ایک کانفرنس طلب کی جائے اور یہ تجویز تیزی سے مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔ مجھے آپ کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ ابھی ہماری قوم اس قدر منظم نہیں ہے اور ابھی اس قسم کی کانفرنس منعقد کرنے کا صحیح وقت بھی نہیں آیا، لیکن میری رائے ہے کہ آپ اپنے خطبے میں کم از کم اس طریق عمل کی طرف ضرور اشارہ کریں جو شمالی مغربی ہندوستان کے مسلمان بالآخر مجبوراً اختیار کریں گے۔

میرے خیال میں نیا آئین جس کا مقصد ہے کہ تمام ہندوستان پر مشتمل ایک

وفاق قائم کرے، قطعاً مایوس کن ہے۔ ہندوستان میں امن و امان قائم کرنے اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے تسلط سے بچانے کی واحد ترکیب یہی ہے کہ جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ مسلم صوبوں کی علیحدہ فیڈریشن قائم کی جائے۔ کیا وجہ ہے کہ شمالی مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو علیحدہ قوم تصور نہ کیا جائے اور جنہیں حق خوداختیاری حاصل ہو جس طرح کہ ہندوستان کی دیگر اقوام کو اور بیرون ہند لوگوں کو حاصل ہے۔

ذاتی طور پر میری رائے ہے کہ شمالی مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو فی الحال مسلم اقلیتی صوبوں کو نظرانداز کر دینا چاہئے۔ مسلم اکثریتی اور مسلم اقلیتی صوبوں کا بہترین مفاد اس وقت اسی طریق سے وابستہ ہے۔ اس لئے مسلم لیگ کا آئندہ اجلاس کسی مسلم اقلیتی صوبے میں منعقد کرنے کی بجائے پنجاب میں منعقد کرنا زیادہ بہتر ہو گا۔ لاہور میں اگست کا مہینہ تکلیف دہ ہوتا ہے میرا خیال ہے کہ آپ کو لاہور میں وسط اکتوبر میں جب موسم خوش گوار ہو جاتا ہے مسلم لیگ کے اجلاس کے انعقاد کے امکان پر غور کرنا چاہئے۔ پنجاب میں آل انڈیا مسلم لیگ میں دلچسپی بڑھ رہی ہے اور آئندہ اجلاس کا پنجاب میں منعقد ہونا پنجاب کے مسلمانوں میں نئی سیاسی بیداری پیدا کرنے کا باعث ہو گا۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

لاہور، ۱۱ اگست ۱۹۳۷ء

مائی ڈیر مسٹر جناح

حالات نے یہ بات واشگاف طور پر واضح کر دی ہے کہ لیگ کو اپنی تمام سرگرمیوں کا مرکز شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بنانا چاہیے۔ لیگ کے دہلی آفس سے مسٹر غلام رسول کو یہ اطلاع ملی کہ لیگ کے آئندہ اجلاس کی تاریخیں ابھی تک طے نہیں ہوئی ہیں۔

اندریں حالات مجھے اندیشہ ہے کہ لیگ کا اجلاس اگست اور ستمبر میں منعقد نہیں ہو سکے گا۔ لہٰذا میں اپنی اس درخواست کو دوبارہ دہراتا ہوں کہ لیگ کا اجلاس لاہور میں وسط یا اواخرِ اکتوبر میں طلب کیا جائے۔ پنجاب میں لیگ کے لئے جوش تیزی سے بڑھ

رہا ہے اور مجھے اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ لاہور میں لیگ کا اجلاس بلانا لیگ کی تاریخ میں ایک اہم موڑ ثابت ہوگا اور عوام سے رابطہ پیدا کرنے کی جانب ایک اہم قدم ہوگا۔ از راہ کرم اس خط کے جواب میں چند سطریں تحریر فرمایئے۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال بار ایٹ لا

پرائیویٹ و خفیہ

لاہور، ۷ اکتوبر ۱۹۳۷ء

مائی ڈیر مسٹر جناح

لیگ کے اجلاس لکھنؤ میں پنجاب سے ایک مضبوط گروپ شریک ہوگا۔ سر سکندر حیات کی زیر قیادت یونینیسٹ مسلمان بھی اجلاس میں شرکت کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ آج کل ہم بہت مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں۔ ہندوستانی مسلمان آپ سے توقع رکھتے ہیں کہ اس پر آشوب زمانے میں آپ اپنے خطبے میں نہایت واضح الفاظ میں ان کی مکمل ترین رہنمائی فرمائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ لیگ کو کمیونل ایوارڈ سے متعلق اپنی پالیسی یا مکرر وضاحت کا اعلان ایک موزوں قرارداد کی شکل میں کرنا چاہیے۔ میرے سننے میں آیا ہے کہ پنجاب اور سندھ میں بعض گمراہ مسلمان کمیونل ایوارڈ میں ہندوؤں کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے کچھ تبدیلی کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ لوگ شاید اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہندوؤں کو خوش کرنے کے بعد وہ اپنا اقتدار قائم رکھ سکیں گے۔ میری ذاتی رائے ہے کہ چونکہ برطانوی حکومت ہندوؤں کو خوش کرنے کی فکر میں ہے اس لئے وہ (ہندو) کمیونل ایوارڈ میں تبدیلی کو خوش آمدید کہیں گے۔ اس غرض سے برطانوی حکومت اس کوشش میں ہے کہ اپنے مسلمان ایجنٹوں کے ذریعے اس میں گڑبڑ کرائے۔

میں لیگ کونسل کی خالی نشستوں کے لئے ۲۸ افراد کی ایک فہرست تیار کروں گا۔ مسٹر غلام رسول یہ فہرست آپ کو دکھائیں گے۔ مجھے امید ہے کہ یہ انتخاب بہت احتیاط کے بعد ہی کیا جائے گا۔ ہمارے آدمی ۱۳ تاریخ کو لاہور سے روانہ ہوں گے۔

مسئلہ فلسطین مسلمانوں کے ذہنوں میں بہت اضطراب پیدا کر رہا ہے۔ لیگ کے مقاصد کے لئے عوام سے قریب تر آنے کا اس سے بہتر موقع اور کونسا ہو سکتا ہے۔

مجھے قوی امید ہے کہ لیگ اس "مسئلہ فلسطین" پر ایک بہت ہی سخت قرارداد منظور کرے گی، ساتھ ہی لیڈروں کی ایک غیر رسمی کانفرنس بھی منعقد کی جائے جہاں ایک مثبت لائحہ عمل طے کیا جائے جس کے ذریعے مسلمان بڑی تعداد میں شامل ہو سکیں۔ اس طریق سے لیگ کو فوراً مقبولیت حاصل ہو گی اور شاید فلسطین کے عربوں کو بھی کچھ فائدہ پہنچ جائے۔ ذاتی طور پر میں کسی ایسے امر کی خاطر جیل جانے کو بھی تیار ہوں جس سے اسلام اور ہندوستان متاثر ہوتے ہوں۔ مشرق کے دروازے پر مغرب کا ایک اڈہ بننا اسلام اور ہندوستان دونوں کے لئے پر خطر ہے۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

مکرر: لیگ کو یہ قرارداد منظور کرنی چاہئے کہ کوئی بھی صوبہ کمیونل ایوارڈ کے سلسلے میں کسی دوسری قوم کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کرنے کا مجاز نہیں، چونکہ اس مسئلے "کمیونل ایوارڈ" کا تعلق تمام ہندوستان سے ہے اس لئے اس کو طے کرنے کا حق صرف لیگ ہی کو حاصل ہے۔ آپ ایک قدم اور آگے جا سکتے ہیں کہ موجودہ نامناسب فضا کسی فرقہ دار مصالحت کے لئے سازگار نہیں۔

لاہور، یکم نومبر ۱۹۳۷ء

مائی ڈیر مسٹر جناح

امید ہے کہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی قرارداد آپ کی نظر سے گزری ہو گی۔ آپ کی بروقت تدبیر کارگر ثابت ہوئی۔ ہم سب لوگ کانگرس کی قرارداد پر آپ کے تاثرات کے منتظر ہیں۔ لاہور کے اخبار ٹریبون نے پہلے ہی اس پر نکتہ چینی کی ہے اور میرا خیال ہے ہندو بالعموم اس کی مخالفت ہی کریں گے، لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے انہیں اس بات کے نشے میں نہیں رہنا چاہئے، بلکہ ہمیں نظم ملت کا کام پہلے سے زیادہ جوش اور ولولے کے ساتھ جاری رکھنا چاہئے اور اس وقت دم نہیں لینا چاہئے جب تک پانچ صوبوں میں مسلم حکومتیں قائم نہ ہو جائیں اور بلوچستان میں اصلاحات رائج نہ ہو جائیں۔

یہاں افواہ ہے کہ یونینسٹ پارٹی کا ایک حصہ لیگ کے مسلک پر دستخط کرنے

کو تیار نہیں ہے۔ ابھی تک سر سکندر اور ان کی پارٹی کے لوگوں نے ان پر دستخط نہیں لئے ہیں۔ ہم نے آج صبح ہی سنا کہ وہ لیگ کے آئندہ اجلاس تک انتظار کریں گے۔ اس سے ان کا مقصد جیسا کہ ان میں سے ایک نے مجھے یہ بتایا ہے کہ صوبائی لیگ کی سرگرمیوں کو معطل کر دیا جائے۔ بہرحال میں چند روز تک آپ کو تمام حقائق کی تفصیل بھیج دوں گا۔ پھر آپ کی رائے معلوم کروں گا کہ ہمیں کس طرح اپنا کام آگے بڑھانا چاہئے۔ مجھے قوی امید ہے کہ آپ اجلاس لاہور سے قبل کم از کم دو ہفتے کے لئے پنجاب کا دورہ کریں گے۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

بہت ضروری

لاہور، یکم نومبر ۱۹۳۷ء

مائی ڈیر مسٹر جناح

سر سکندر حیات خاں کل اپنی پارٹی کے چند ممبروں کے ساتھ میرے یہاں تشریف لائے اور لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے درمیان اختلافات کے سلسلے میں ہماری کافی طویل گفتگو ہوئی۔ فریقین نے اخبارات کو بیانات جاری کر دیئے ہیں۔ دونوں فریقوں نے سکندر جناح پیکٹ کی اپنے مقصد کے مطابق تاویلات کی ہیں۔ اس سے کافی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی لکھا، میں یہ تمام بیانات آپ کو روانہ کر دوں گا۔ فی الحال میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ مجھے اس سمجھوتے کی نقل ارسال کر دیں جس پر سر سکندر نے دستخط کئے ہیں۔ جیسا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ آپ کے پاس موجود ہے۔ میں یہ بھی جاننا چاہوں گا کہ آیا آپ اس بات پر راضی ہو گئے تھے کہ صوبائی پارلیمانی بورڈ پر یونینسٹ پارٹی کا کنٹرول رہے گا۔ سر سکندر نے مجھے بتایا ہے کہ آپ اس پر راضی ہو گئے تھے۔ اس لئے اب ان کا مطالبہ ہے کہ "پارلیمنٹری" بورڈ میں یونینسٹ پارٹی کی اکثریت ہونی چاہئے مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے سکندر جناح پیکٹ میں ایسی کوئی بات نہیں۔

از راہِ کرم اس خط کا جواب جلد از جلد تحریر فرمائیں۔ ہمارے آدمی صوبے کا

دورہ کر رہے ہیں اور مختلف مقامات پر لیگ کی شاخیں قائم کر رہے ہیں۔ گزشتہ شب لاہور میں ہمارا ایک بہت کامیاب جلسہ منعقد ہوا اور امید ہے ایسے اور بھی جلسے ہوں گے۔

آپ کا مخلص
محمد اقبال بار ایٹ لا

لاہور ' ۱۰ نومبر ے ۱۹۳ء

مائی ڈیر مسٹر جناح

سر سکندر اور ان کے ساتھیوں سے متعدد گفتگوؤں کے بعد میں اس قطعی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ اس سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہوں گے کہ لیگ اور صوبائی پارلیمانی بورڈ کا مکمل اختیار ان کو دے دیا جائے۔ آپ کے ساتھ ان کا جو معاہدہ ہوا اس میں یہ مذکور ہے کہ پارلیمانی بورڈ کی تشکیل نو کی جائے گی اور یونینسٹ پارٹی کو اس میں اکثریت حاصل ہو گی۔ سر سکندر نے مجھے بتایا ہے کہ آپ نے اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ بورڈ میں ان کو اکثریت دے دی جائے۔ میں نے کچھ دن ہوئے آپ سے دریافت کیا تھا کہ آیا آپ واقعی بورڈ میں یونینسٹ پارٹی کو اکثریت دینے پر رضامند ہو گئے تھے۔ ابھی تک مجھے آپ کا جواب نہیں ملا۔ ذاتی طور پر مجھے اس بات میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا کہ اپنے لئے جو اکثریت وہ چاہتے ہیں وہ انہیں دے دی جائے' لیکن جب وہ لیگ کے عہدہ داران میں تبدیلی چاہتے ہیں تو وہ معاہدے سے ہٹ جاتے ہیں۔ مثلاً خاص طور سے وہ لیگ کے موجودہ سیکرٹری "غلام رسول خاں" کو بدلنے کے خواہاں ہیں جس نے لیگ کے لئے اتنا کچھ کیا ہے۔ وہ اس بات کے بھی خواہش مند ہیں کہ لیگ کے مالی معاملات پر ان کے آدمی کا کنٹرول رہے۔ میرے خیال میں تو وہ اس طرح لیگ پر قبضہ جما کر اسے ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ صوبے کی رائے عامہ کو جانتے ہوئے میں اس بات کی ذمہ داری نہیں لے سکتا کہ لیگ کو سر سکندر اور ان کے دوستوں کے حوالے کر دیا جائے۔ اس معاہدے "سکندر جناح پیکٹ" نے پہلے ہی صوبے میں لیگ کے وقار کو کافی نقصان پہنچایا ہے اور یونینسٹ حضرات کی عیاریاں اسے اور بھی نقصان پہنچائیں گی۔ ان لوگوں نے ابھی تک لیگ کے نصب العین پر دستخط نہیں کئے ہیں اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ کرنا بھی نہیں

چاہتے۔ یہ لوگ لیگ کا اجلاس لاہور میں فروری کی بجائے اپریل میں منعقد کرنا چاہتے ہیں۔ میرے خیال میں وہ اپنی زمیندارہ لیگ کے قیام و استحکام کے لئے مہلت حاصل کرنے کی فکر میں ہیں' شاید آپ کو علم ہو گا کہ سرسکندر نے لکھنؤ سے واپسی پر ایک زمیندارہ لیگ بنائی تھی اور اب اس کی شاخیں تمام صوبے میں قائم کی جا رہی ہیں۔ از راہ کرم بتلائیں کہ ہم ان حالات میں کیا کریں۔ اگر ممکن ہو تو بذریعہ تار اپنی رائے سے مطلع فرمائیں اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو جس قدر جلد ممکن ہو کہ ایک تفصیلی خط تحریر فرمائیں۔

آپ کا مخلص
محمد اقبال

مطبوعات بیکن بکس

مصر کا قدیم ادب چار جلدیں	ابنِ حنیف	۱۵۰۰
دُنیا کا قدیم ترین ادب ۲ جلد	ابنِ حنیف	۵۰۰
بھولی بسری کہانیاں بھارت	ابنِ حنیف	۳۰۰
بھولی بسری کہانیاں مصر	ابنِ حنیف	۱۲۰
زبان کیا ہے	خلیل صدیقی	۹۵
آواز شناسی	خلیل صدیقی	۷۰
غالب اور اقبال	ڈاکٹر اے بی اشرف	۵۰
اُردو ڈراما اور آغا حشر	ڈاکٹر اے بی اشرف	۱۲۵
اُردو افسانہ تحقیق و تنقید	ڈاکٹر انوار احمد	۲۵۰
عزیزان علی گڑھ	رشید احمد صدیقی	۹۰
نذر مسعود	ڈاکٹر خلیل بیگ	۲۱۰
پاکستان میں پرائمری تعلیم تحقیق و تجزیاتی مطالعہ	مہر گل محمد	۸۰
ہندو صنمیات	ڈاکٹر مہر عبدالحق	۳۵۰
دیکھ لیا ملتان	ڈاکٹر زاہد علی واسطی	۳۰۰
بہاولپور کی سرزمین	ڈاکٹر زاہد علی واسطی	۳۰۰
سفر کہانی	نوشابہ نرگس	۱۲۵
جا تیرا امریکہ دیکھ لیا	ڈاکٹر زاہد علی واسطی	۳۰۰
وسندی رُت دی شام	حفیظ خان	۶۰
خط اس بچے کے نام جو کبھی پیدا نہ ہوا	خالد سعید	۷۰
عکس خواب	مستحسن خلجی	۷۰
پُروا	مبینہ عظیم	۶۰
مگر تم زندہ رہنا	جاوید اختر بھٹی	۴۰
آدھا راستہ	نجمہ افتخار راجہ	۱۲۵
پراگندہ طبع لوگ	انور جمال	۶۵
سایونارا	نجمہ افتخار راجہ	۱۵۰
کتاب دوستاں	محمد اظہر سلیم مجوکہ	۷۵
تعلیمی نفسیات	ملک محمد آصف	۵۰
ہمیں صحرا نہ راس آیا	محسن حیات اثر	۵۰